تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبرِ قرآن و حدیث

رحمان سٹریٹ مسلم کالونی سمن آباد، لاہور

مجلسِ ترتیب

- ——— خالد مسعود (مدیر)
- ——— جاوید احمد
- ——— عبداللہ غلام احمد
- ——— ماجد خاور

ناشر : ادارہ تدبر قرآن وحدیث
مطبع : المطبعۃ العربیۃ پرانی انارکلی - لاہور

قیمت : ۳/= روپے

تدبر

سلسلہ نمبر ۷	شعبان ۱۴۰۳ھ	مئی ۱۹۸۳ء

فہرست مضامین

تذکرہ و تبصرہ

فقہی اختلافات کا حل ——— خالد مسعود ۳

تدبرِ قرآن

دیباچہ تفسیر 'تدبر قرآن' ——— امین احسن اصلاحی ۷

سورۂ بقرہ (۷) ——— خالد مسعود ۱۱

اصولِ تدبرِ حدیث

سند کی عظمت اور اس کے بعض کمزور پہلو ——— امین احسن اصلاحی / ماجد خاور ۱۸

تدبرِ حدیث

عورت کے کردار کے چند قابلِ اصلاح پہلو ——— خالد مسعود ۲۶

تزکیۂ نفس

تعلق باللہ اور اس کی اساسات : وفا ——— امین احسن اصلاحی ۳۶

مراسلہ و مذاکرہ

سودی قرضوں کے بل پر ترقی ——— امین احسن اصلاحی / ماجد خاور ۴۵

معاشرہ کا بگاڑ ——— پروفیسر ارشاد الحسن ۴۷

تذکرہ و تبصرہ

خالد مسعود

فقہی اختلافات کا حل

ہمارے ملک میں اس وقت کتنی ادارے اس بات کا جائزہ لینے کے لئے قائم ہیں کہ رائج الوقت قوانین اسلامی شریعت سے ہم آہنگ ہیں یا نہیں ان اداروں کے کام کی پیش رفت اخبارات کے ذریعے عوام کو پہنچتی رہتی ہے ۔ حکومت نے دین کے بعض ان احکام کو نافذ کرنے کے لئے اقدامات کئے ہیں جن پر ہمارا معاشرہ کسی اجتماعی نظم کے تحت عمل نہیں کر رہا تھا حکومت کی یہ کوششیں مستحسن ہیں اور حامیانِ دین پوری دردمندی کے ساتھ ان کو کامیاب بنانے کے متمنی ہیں۔ جن لوگوں کی حالات پر گہری نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ نفاذِ شریعت میں سب سے بڑی رکاوٹ فقہی اختلافات کے سبب سے ہے جو علماء اور قانون سازوں کو بیشتر مسائل میں کوئی متفقہ لائحہ عمل اختیار نہیں کرنے دیتے ۔ ایک فقہ کے ماننے والوں نے عملاً اپنے فرقہ کو شریعت کے طوق سے آزاد رکھنے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے ۔ یہ صورتِ حال اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ دینی فہم اور جذبہ رکھنے والے لوگ اُمت کے فقہی اختلافات کے پیچیدہ مسئلہ پر غور کریں اور ایسا طریقِ کار وضع کریں جو نفاذِ شریعت کے مقصد کے حصول کو یقینی بنائے ۔

اس اہم مسئلہ پر جو اس وقت ہمارے اربابِ حل و عقد کے سامنے ہے ، مولانا امین احسن اصلاحی کی ایک کتاب "اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے ۔ اس کتاب میں مولانا نے مسئلہ کے تمام ضروری پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے ۔ کتاب کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:

" مسلمانوں کے درمیان جو فقہی اختلافات ہیں ، اگرچہ وہ بالکل سرسری اور سطحی ہیں لیکن امتدادِ زمانہ سے ان کی جڑیں اتنی گہری اتر چکی ہیں کہ اب ان کا اکھاڑنا آسان نہیں رہا اور ان کے اکھاڑے بغیر

صحیح نہج پر اسلامی قانون کی تدوین ہی ممکن ہے اور نہ اس کے مؤثر نفاذ ہی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان من حیث الجماعت اس اصول پر مجتمع ہوں کہ ان کے قانون کے پرکھنے کے لئے اصل کسوٹی قرآن و سنت ہیں اور ان پر یہ واجب ہے کہ وہ ان کسوٹیوں کو اپنے دوسرے تمام تعصبات و تعلقات سے بالکل دست بردار ہو کر تسلیم کریں۔" (ص)

"یہ اللہ تعالیٰ کے دین کا کام، بلکہ سب سے بڑا کام ہے۔ یہ اس شکل میں نتیجہ خیز اور بابرکت ہوگا جب اس کو پورے اخلاص کے ساتھ اللہ اور رسول کے بتائے ہوئے طریقہ پر کیا جائے، ورنہ اندیشہ ہے کہ یہ ان ناکامیوں کی فہرست میں ایک اور اضافہ کرے گا جو اس سے پہلے اس سلسلہ میں ہو چکی ہیں۔" (ص)

کتاب ۱۲۰ صفحات پر پھیلے ہوئے آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جن میں صدرِ اوّل کے مسلمانوں کے طرزِ عمل پر روشنی ڈالی گئی ہے اور امت کے طرزِ عمل میں اس تبدیلی کی نشاندہی کی گئی ہے جو فقہ و حدیث کے مرتب ہونے کے بعد پیدا ہوئی۔ فقہی اختلافات کے اسباب متعین کیے گئے ہیں اور وہ حل تجویز کیا گیا ہے۔ جس سے امت کو پھر صدرِ اوّل کے مسلمانوں کے طرزِ عمل پر واپس لایا جاسکتا ہے۔ دو ابواب میں اسلامی ریاست میں فرقوں کی حیثیت اور اسلامی قانون کی تدوین کی سابقہ کوششوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

صدرِ اوّل کے طرزِ عمل کے تحت مولانا لکھتے ہیں:

"جب تک اسلامی نظام اپنی اصلی صورت میں قائم رہا، اس وقت تک امت میں اگرچہ ہر قسم کے فقہی اختلافات پیدا ہوتے تھے، اہل علم ان اختلافات پر پوری آزادی کے ساتھ بحثیں بھی کرتے تھے، لیکن یہ اختلافات مسلمانوں کے اندر انتشار اور تفرق پیدا کرنے کا سبب نہیں بنتے تھے کیونکہ ہر اختلاف بالآخر خلیفہ کے سامنے پیش ہوتا اور وہ اس کے بارے میں اپنی مجلس شوریٰ سے مشورہ کرکے کوئی منقح بات طے کر دیتا جس کو سب تسلیم کرلیتے اور اگر اس طرح کے فیصلہ سے کسی خاص شخص کو اختلاف بھی ہوتا تو اس اختلاف کی حیثیت صرف ایک رائے کی ہوتی۔ قضا اور فتویٰ کے سارے معاملات خلیفہ اور مجلس شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق ہی انجام پاتے۔" (ص۳۳)

کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بابرکت دَور کے بعد اہل فقہ اور اہل حدیث دونوں نے غلو سے کام لیا۔ تخریج اور روایات کے مابین ایک جنگ شروع ہوگئی جس میں اہل فقہ نے اپنے علماء کے قرار دادہ اصول بجائے خود دین کا ماخذ بنالیے اور تخریج کو اتنی اہمیت دی کہ بسا اوقات انھوں نے صحیح

روایات کو بھی نظر انداز کر دیا۔ اہلِ حدیث کو اپنے اصولوں کی پاسداری میں اتنا غلو ہوا کہ وہ تخریج کی ضرورت ہی کے منکر ہوگئے اور روایات کو ان کے اصلی حق سے کہیں زیادہ وزن دے دیا۔ چوتھی صدی ہجری کے بعد اس کشمکش نے ایسی صورت اختیار کرلی کہ تقلید جامد کو اپنے پنجے گاڑنے کا موقع مل گیا اور یوں اُمت اس قوت متحرکہ سے محروم ہوگئی جو شریعت نے اُسے عطا کی تھی۔

مولانا کی تحقیق میں فقہ کے مختلف مذاہب میں اصولِ فقہ کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ دین کی اساسات اور مواد اجتہاد کی ترتیب میں جو تقدیم و تاخیر ہے اس پر بھی سب کا اتفاق ہے۔ قیاس اور تخریجِ مسائل کے اصول ایک جیسے ہیں۔ اس لئے اگر لوگ تعصب سے کام نہ لیں تو ان کو اسلامی قانون پر متفق کر لینا ناممکن نہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے صحابۂ کرام اور فقہا کا علم اور احادیث کا پورا ذخیرہ مرتب صورت میں موجود ہے۔ اس لیے ہمیں یہ سہولت میسر ہے کہ ہر بات کے دلائل کو ہر قسم کے تعصبات سے آزاد ہو کر جانچ پرکھ سکیں اور ان میں سے جس کو کتاب و سنت سے قریب تر پائیں، اس کو اختیار کرلیں (ص) مولانا کے نزدیک فقہا کے ذہن میں یہ تبدیلی آنی چاہیے کہ وہ اس صورت میں اپنے اجتہادات کو وزن نہ دیں جب ایسی روایات مل جائیں جو کتاب و سنت کے عام مزاج سے موافق نظر آئیں۔ اسی طرح اہل حدیث کے اندر یہ آمادگی ہونی چاہیے کہ وہ اخبارِ آحاد کے اندر جو پہلو ضعف کے موجود ہوں ان کا اعتراف کریں۔ اس طرح فرقوں کے مابین ایک بڑا سبب اختلاف رفع ہو سکتا ہے۔ (ص) مولانا کے نزدیک ہمارے دین میں پیدائشی حنفی اور پیدائشی اہل حدیث کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ عوام کو ان گروہ بندیوں سے اس طرح آزاد کرنے کی ضرورت ہے جس طرح اسلام کی ابتدائی صدیوں کے مسلمان ان گروہ بندیوں سے آزاد تھے۔ اس کی عملی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مدارس میں کسی ایک ہی متعین فقہ کی تعلیم دینے کے بجائے پوری اسلامی فقہ کی تعلیم دی جائے تاکہ لوگ فقہا کے دلائل سے واقف ہوں اور ان کے اندر یہ اہلیت پیدا ہو کہ وہ دلائل کا موازنہ کرکے اس حکم کو اختیار کر سکیں، جو اوفق بالکتاب والسنۃ ہو۔ (ص)

مولانا نے فقہی معاملات سے متعلق ایک صحیح اسلامی حکومت کے طرزِ عمل کو بھی واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ حکومت کسی متعین امام کی تقلید کے اصول پر قائم نہیں ہوتی بلکہ اس کی اساس براہِ راست کتاب و سنت اور اجتہاد و شوریٰ پر ہوتی ہے۔ اسلامی حکومت اپنے شہریوں کے ان جزوی امور سے کوئی تعرض نہیں کرتی جن کا تعلق انفرادی زندگی سے ہوتا ہے۔ اس کا تعلق صرف ظاہری اعمال و عقائد تک محدود ہوتا ہے۔ جو اجتماعی و معاشرتی اور سیاسی زندگی سے لگاؤ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اس طرح ہر شہری اس بات میں بالکل

آزاد ہوتا ہے کہ وہ اپنی انفرادی زندگی کے دائرہ میں جس فقہی وکلامی مسلک کو ترجیح دیتا ہو اس کو اختیار کر لے، لیکن اجتماعی مسائل میں اُسے حکومت کے قانون اور فیصلے کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ وہ اپنے فقہی مسلک کی بنا پر ان سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

مولانا کی یہ کتاب وقت کی ضرورت کو بطریقِ احسن پورا کرتی ہے اور اپنے موضوع پر شاید یہ واحد کتاب ہے جو کام کے لئے مثبت تجاویز پیش کرتی ہے۔ اس میں مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا مواجہہ کیا گیا ہے۔ اسلامی قانون کے طلبہ اور اہلِ حل وعقد اس سے یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کتاب مجلد اور دیدہ زیب ہے۔ اسے فاران فاؤنڈیشن، ۲۲ا فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور ۱۶ نے شائع کیا ہے۔ اس کی قیمت بارہ روپے ہے۔

بقیہ:

سودی قرضوں کے بل پر ترقی

نے اپنے بعد آنے والوں کی ہمت توڑ دی۔ کس کی مجال ہے کہ اس نمونے کی تقلید کرے!

ان خطوط پر معاشی انقلاب اگر مقصود ہو تو صبح وشام میں ہو سکتا ہے۔ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ قوم کو کسی دوسری متمول قوم کی جکڑ بندی میں دینے کے بجائے اسے آزاد اور حُر کی حیثیت سے جینے کا موقع دیا جائے۔ ورنہ سودی قرضوں کا یہ جکڑ بند کبھی بھی کوئی صحیح کام نہیں کرنے دے گا۔

(ترتیب: ماجد خاور)

دیباچہ

امین احسن اصلاحی

تدبرِ قرآن

یہ دیباچہ مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہٗ نے اپنی تفسیر 'تدبر قرآن' کے نو ترتیب ایڈیشن کے لیے رقم فرمایا جسے ہم افادۂ قارئین 'تدبر' کے لیے شائع کر رہے ہیں۔

(ادارہ)

میں اس بات کا آرزومند تھا کہ میری ناچیز تالیفات، بالخصوص 'تدبر قرآن'، کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داری کوئی ایسا شخص اٹھائے جو اس فکر کا حامل ہو جو ان کتابوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے یہ آرزو پوری کر دی۔ عزیزم ماجد خاور صاحب سلمہٗ میرے پُرانے رفقاء میں سے ہیں۔ وہ نہ صرف میرے فکر سے، بلکہ بحیثیت مجموعی پورے فکرِ فراہی سے بڑی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے پورے عزم وحوصلہ کے ساتھ اب اس فکر کی ترویج واشاعت کا بیڑا اٹھا لیا ہے اور وہ اپنے ادارہ: فاران فاؤنڈیشن کو اس کے قیام کے دن سے ہی' اسی مقصد کے لیے مختص کیے ہوئے ہیں۔ مجھے ان کی صلاحیتوں سے پوری توقع ہے کہ وہ اس خدمت کو بحسن وخوبی انجام دے سکیں گے اور خدا نے چاہا تو آئندہ تھوڑے عرصہ میں' ان کے اور ادارۂ تدبرِ قرآن وحدیث کے تعاون سے وہ قرآنی فکر وفلسفہ بالکل واضح ہو کر لوگوں کے سامنے آ جائے گا جو اس عہد کے چیلنج کا اصل جواب ہے۔

اپنی ناچیز تالیفات سے متعلق اگر میں مشہور فلسفی' عمانوئیل کانٹ کے لفظوں میں یہ بات کہوں

تو غالباً بے جا نہ ہوگی کہ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ میں نے سوچا وہ سب لکھ دیا ہے، لیکن یہ ایک امرِ واقعی ہے کہ جو کچھ لکھا ہے وہ اچھی طرح سوچ کر لکھا ہے۔ "تفسیر تدبرِ قرآن" پر میں نے اپنی زندگی کے پورے ۵۵ سال صرف کیے ہیں۔ جن میں سے ۲۳ سال صرف کتاب کی تحریر و تسوید کے نذر ہوئے ہیں۔ اگر اس کے ساتھ وہ مدت بھی ملا دی جائے جو استاذِ امام رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن کے غور و تدبر پر صرف کی ہے اور جس کو میں نے اس کتاب میں سمونے کی کوشش کی ہے تو یہ کم و بیش ایک صدی کا قرآنی فکر ہے، جو آپ کے سامنے تفسیر "تدبرِ قرآن" کی صورت میں آیا ہے۔ اگرچہ میں اپنے فکر کو حضرت الاستاذ علیہ الرحمۃ کے فکر کے ساتھ ملانا بے ادبی خیال کرتا ہوں۔ لیکن چونکہ واقعہ یہی ہے کہ میں نے عمر بھر استاذ ہی کے سُر میں اپنا سُر ملانے کی کوشش کی ہے اور میرا فکر ان کے فکر کے قدرتی نتیجہ ہی کے طور پر ظہور میں آیا ہے اس وجہ سے یہ جوڑ ملانے کی جسارت بھی کر رہا ہوں اگر یہ بے ادبی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمائے۔

میں نے یہ بات تعلّی کے طور پر نہیں، بلکہ بیانِ واقعہ کے طور پر کہی ہے اور مقصود اس سے یہ ہے کہ جو حضرات میری کسی تحریر پر تنقید کرنے کا شوق رکھتے ہوں وہ شوق سے تنقید کریں، لیکن میرے دلائل ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں؛ اپنی اس خواہش کے احترام کی مجھ سے توقع نہ رکھیں کہ میں وہی کچھ لکھ دوں جو انھوں نے اپنے استادوں سے سنا اور اپنی مانوس کتابوں میں پڑھا ہے۔ کتاب و سنّت کے سوا میں کسی چیز کو حجت نہیں سمجھتا اور غور و تدبر، میرے نزدیک، انسانی فضائل میں سب سے برتر اور سب سے اعلیٰ فضیلت ہے۔ میری کوشش یہ ہے کہ ایک مدت دراز سے قرآن و حدیث پر غور و تدبر کی جو راہ مسدود ہے وہ اب کھل جائے اور اگر اس راہ میں مجھ سے کوئی خدمت بن آئی ہے تو مجھے اس سے ہچکچانا نہیں چاہیے۔ اگر نیت نیک ہے تو ان شاء اللہ مجھے اس کوشش کا اجر ملے گا۔

یہاں اُن دو باتوں کا ذکر بھی قارئینِ تدبرِ قرآن کی دلچسپی کا باعث ہوگا جو حسنِ اتفاق کے طور پر اس کتاب سے وابستہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآنِ مجید کی کل آیات ۶۲۳۶ ہیں اور ان کی تفسیر "تدبرِ قرآن" کے کم و بیش اتنے ہی صفحات میں آئی ہے۔ گویا ہر آیت کی تفسیر کے لیے اس کتاب کا تقریباً ایک صفحہ مختص ہوا۔ دوسرے یہ کہ قرآنِ مجید کا زمانۂ نزول ۲۳ سال ہے اور تدبرِ قرآن کا زمانۂ تحریر و تسوید بھی ۲۳ سال ہے۔ میں اس باب میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ "ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ"۔

اس تمہیدی گزارش کے بعد اب وہ چند اصلاحات بھی سن لیجیے جو تدبرِ قرآن کے اس نئے دور کے نئے ایڈیشن میں ملحوظ رکھی گئی ہیں:

۱۔ تمام جلدوں کو حجم کے اعتبار سے متوازن کرنے کے لیے کتاب کو آٹھ کی بجائے نو جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ آخری چار جلدیں تو اپنی موجودہ صورت ہی پر باقی رہیں گی۔ لیکن ابتدائی چار جلدیں، پانچ جلدوں میں کر دی گئی ہیں تاکہ ان کے حجم کا عدم توازن دور ہو جائے۔

۲۔ پورے متن پر نہایت اہتمام سے نظرِ ثانی کی گئی ہے اور اس کام میں خود مصنّف نے بھی حصہ لیا ہے۔

۳۔ بعض عنوانات مزید واضح کر دیے گئے ہیں تاکہ ان سے پوری رہنمائی حاصل ہو سکے۔

۴۔ عنوانات میں یکسانی و ہم رنگی کا اہتمام کیا گیا ہے۔

۵۔ جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے، مزید ذیلی عنوانات کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۶۔ پچھلے ایڈیشنوں میں بعض جگہ آیات کی تفسیر کرتے ہوئے ان کا حوالہ مجملاً دیا گیا تھا، اب وہ آیات پوری نقل کر دی گئی ہیں۔

۷۔ پچھلے ایڈیشنوں میں بعض جگہ کسی آیت کی تفسیر یا کسی لفظ کا ترجمہ سہواً رہ گیا تھا، اس کی تصحیح کر دی گئی ہے۔

۸۔ ہر صفحہ کی پیشانی پر زیرِ تفسیر سورہ کا نام اور اس کا نمبر درج کر دیا گیا ہے۔

۹۔ ہر جلد کے آخر میں نئی مفصّل فہرستِ مضامین دی گئی ہے۔

خاص تفسیر سے متعلق مستقبل قریب میں جو کام انجام دینے کی سکیم ہے، ان میں سے دو کام بڑی اہمیت رکھنے والے ہیں:

ایک یہ کہ "نظام القرآن" کے نام سے پورا متنِ قرآن مع ترجمۂ قرآن اپنی معنوی تقسیم کے لحاظ سے — مطابق ترجمۂ تدبرِ قرآن — ایک ہی جلد میں اس طرح چھاپنے کا اہتمام کیا جا رہا ہے کہ اس میں ہر سورہ سے متعلق تجزیاتی نوعیت کے اصولی مباحث شامل ہوں اور اس سے آیات کے باہمی نظم کی طرف بھی رہنمائی ہو تاکہ ایک عام قاری بھی قرآنِ مجید کی تلاوت کرے تو اس کے نظم کی رہنمائی سے، جو فہمِ قرآن کی کلید ہے، محروم نہ رہے۔ اسے عزیزم ماجد خاور صاحب سلمہٗ تدبرِ قرآن سے ترتیب دے رہے ہیں۔ اس کام کو نہایت اعلیٰ معیار پر انجام دینے کے لیے ضروری تیاریاں کر لی گئی ہیں۔ ان شاء اللہ یہ جلد سامنے آ جائے گا۔ یہ کام اس کے علاوہ ہے جو برادرم خالد مسعود صاحب سلمہٗ تدبرِ قرآن پر مبنی ترجمہ و حواشی کے سلسلہ میں کر رہے ہیں۔

دوسرا یہ کہ مضامین کی جو فہرستیں تفسیر کی موجودہ جلدوں کے ساتھ لگی ہوئی ہیں ان کو مزید وسعت

دے کر ایک جامع اور مکمل انڈکس کی شکل دی جا رہی ہے۔ تاکہ یہ ان لوگوں کے لیے مزید کارآمد ہو سکیں جو قرآن مجید پر ریسرچ کا کام کرنا چاہتے ہوں۔ یہ انڈکس ایک پوری جلد میں آجائے گا اور یہ جلد اس کتاب کی دسویں جلد ہوگی؛ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔

یہ اپنے ارادے اور منصوبے ہیں۔ ان میں سے پورے وہی ہوں گے جن کا پورا ہونا اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا۔ ہم اس کے فیصلوں پر پوری طرح راضی اور مطمئن ہیں۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

لاہور	والسلام
۲۲ مئی ۱۹۸۳ء	
۸ شعبان ۱۴۰۳ھ	امین احسن اصلاحی

تدبر قرآن

خالد مسعود

سورۃ بقرہ (۷)

اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال اور طیب ہیں ان کو کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو[۲۰۳] بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو بس تمہیں برائی اور بے حیائی کی راہ سُوجھائے گا۔ اور اس بات کی کہ تم خدا کی طرف وہ باتیں منسوب کرو جن کے بارے میں تمہیں کوئی علم نہیں ہے[۲۰۴] ۝ ۱۶۹

اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ خدا کی اتاری ہوئی چیز کی پیروی کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جبکہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے رہے ہوں اور نہ راہِ ہدایت پر رہے ہوں[۲۰۵]؟ ان کافروں کی تمثیل ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایسی چیزوں کو پکارے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سنتی اور سمجھتی ہوں[۲۰۶]۔ یہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں، یہ سمجھ نہیں سکتے ۝ ۱۷۱

---

۲۰۳ خدا کے حکم کے بغیر جائز چیزوں کو حرام ٹھہرانا شرک ہے۔ مشرکین عرب شیطان کی پیروی میں مشرکانہ توہمات کے تحت کئی جائز چیزوں اور بعض چوپایوں کو حرام سمجھتے تھے۔ شرک کی اس قسم سے روکا۔

۲۰۴ مثلاً یہ کہنا کہ خدا نے فلاں اور فلاں کو اپنا ساجھی اور شریک قرار دیا ہے یا بغیر کسی سند کے یہ دعویٰ کرنا کہ خدا نے فلاں فلاں قسم کی چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں۔

۲۰۵ یعنی باپ دادا کے طریقے کی پیروی پر اصرار صرف اس وقت معقول قرار دیا جا سکتا ہے جب یہ واضح ہو کہ وہ نہ تو بے سمجھے بُوجھے رسموں کی لکیر پیٹتے رہے اور نہ اپنی خواہشات اور شیطان کی پیروی میں بدعتیں ایجاد کیں۔

۲۰۶ تقلید آباء پر اڑے ہوتے ان کفار کو بھیڑ بکریوں کے گلے سے تشبیہ دی ہے جو عقل و ادراک سے عاری اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے۔ یہ تمثیل تمام عقلی اور روحانی تقاضوں سے ان کی محرومی کی تمثیل ہے۔

اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو بخشی ہیں ان کو کھاؤ اور اللہ ہی کے شکرگزار بنو اگر تم اس کی بندگی کرنے والے ہو۔ اس نے تو بس تمہارے لئے مردار، خون، سور کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کے ذبیحہ کو حرام ٹھہرایا ہے[۲۰۷]۔ اس پر بھی جو مجبور ہو جائے اور وہ خواہش مند اور حد سے آگے بڑھنے والا نہ ہو تو اس کے لئے کوئی گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے ۞ ۱۷۳

بے شک جو لوگ اس چیز کو چھپاتے ہیں جو خدا نے اپنی کتاب میں اتاری ہے اور اس کے عوض میں حقیر قیمت قبول کرتے ہیں، یہ لوگ اپنے پیٹوں میں صرف دوزخ کی آگ بھر رہے ہیں[۲۰۸]۔ ان لوگوں سے خدا قیامت کے دن نہ تو بات کرے گا، نہ ان کو پاک کرے گا۔ ان کے لئے بس عذاب دردناک ہے ۞ یہی لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت پر اور عذاب کو مغفرت پر ترجیح دی۔ یہ دوزخ کے معاملے میں کتنے ڈھیٹ ہیں! ۞ ۱۷۵

یہ اس لئے ہوگا کہ اللہ نے اپنی کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے[۲۰۹] اور جن لوگوں نے اس کتاب کے معاملے میں اختلاف کیا وہ مخالفت میں بہت دور نکل گئے[۲۱۰] ۞ ۱۷۶

خدا کے ساتھ وفاداری محض یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف رُخ کرو[۲۱۱] بلکہ وفاداری ان کی وفاداری ہے جو اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر کتاب پر اور نبیوں پر صدقِ دل سے ایمان لائیں، اور اپنے

---

[۲۰۷] مردار، خون اور سور کے گوشت کی حرمت ان کی ظاہری گندگی کے سبب سے ہے لیکن غیر اللہ کے نام کے ذبیحہ کی حرمت کی وجہ اس کی باطنی گندگی ہے۔ شرک سب سے بڑی عقلی اور باطنی نجاست ہے اس وجہ سے اگر اس کی چھوت کسی پاک چیز کو لگ جائے تو وہ بھی ناپاک ہو جاتی ہے۔

[۲۰۸] یہ اہل کتاب کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے اپنے جی سے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے لیا تھا اور ملت ابراہیمی کے حرام و حلال کے ضابطے کے معاملے میں کتاب الٰہی کی باتوں کو چھپاتے تھے۔ ان پر یہ واضح کیا ہے کہ دین فروشی کے عوض جو دنیا آتی ہے یہ آگ ہے جو وہ اپنے پیٹوں میں بھر رہے ہیں۔

[۲۰۹] کتاب سے مراد قرآن مجید ہے جسے خدا نے قول فیصل کے ساتھ اتارا جس سے ہر طالب حق کے لئے حق کی راہ کھل گئی۔

[۲۱۰] یعنی یہ اتنی دور نکل گئے ہیں کہ ان کے پلٹنے اور تلافی مافات کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہا۔

[۲۱۱] یہ تجدید دین کے تقاضے کے تحت اصل احکام دینے سے پہلے آگاہ کیا ہے کہ خدا کی بندگی اور اطاعت کا حق صرف مشرق و مغرب کی طرف منہ کر لینے سے ادا نہیں ہو جاتا، بلکہ اصل شے وہ اعمال و اخلاق ہیں جن کی شریعت نے تعلیم دی ہے۔

مال اس کی محبت کے باوجود، قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور گردنیں چھڑانے پر خرچ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب معاہدہ کر بیٹھیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہوں[۲۱۲] خاص کر وہ لوگ جو فقر و فاقہ، تکالیفِ جسمانی اور جنگ کے اوقات میں ثابت قدم رہنے والے ہوں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے راست بازی دکھائی اور یہی لوگ ہیں جو سچے متقی ہیں[۲۱۳] ۞ ۱۷۷

اے ایمان والو! تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض ٹھہرایا گیا ہے۔ آزاد، آزاد کے بدلے، غلام، غلام کے بدلے، عورت، عورت کے بدلے[۲۱۴]۔ پس جس کسی کے لیے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ رعایت کی گئی تو اس کے لئے دستور کی پیروی کرنا اور خوبی کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے[۲۱۵]۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے ایک قسم کی تخفیف اور مہربانی ہے۔ تو اس کے بعد جو زیادتی کرے گا اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اور تمہارے لئے قصاص میں، اے عقل والو، زندگی ہے[۲۱۶]۔ تاکہ تم حدودِ الٰہی کی پابندی کرو ۞ ۱۷۹

جب تم میں[۲۱۷] سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر فرض کیا گیا ہے والدین

---

[۲۱۲] ایفائے عہد کے اندر تمام حقوق و فرائض آ جاتے ہیں، خواہ وہ خلق سے متعلق ہوں یا خالق سے، خواہ وہ کسی تحریری معاہدہ سے وجود میں آتے ہوں یا کسی نسبت، تعلق، رشتہ داری اور قرابت سے۔

[۲۱۳] گویا جو لوگ محض چند خالی خولی ظاہرداریوں سے خدا کی وفاداری کا حق ادا کرتے ہیں وہ نہ تو اپنے دعوئے ایمان میں سچے ہیں نہ متقی ہیں۔

[۲۱۴] یہ احترام جان کا قانون بتایا ہے۔ اس کی اصل روح بے لاگ انصاف اور کامل مساوات ہے۔ قصاص اس سزا کو کہتے ہیں جس میں مجرم کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جس کا مرتکب وہ خود ہوا۔

[۲۱۵] یہ اولیائے مقتول کی طرف سے قاتل کے لئے چھوٹ کی طرف اشارہ ہے جس کی شکل قصاصِ مالی یعنی خون بہا اور دیت ہے۔

[۲۱۶] قاتل صرف ایک شخص ہی کو قتل نہیں کرتا بلکہ اس قانون کو قتل کرتا ہے جو سب کی جان کی حفاظت کا قانون ہے۔ اس لئے قصاص ہی میں تمام لوگوں کی زندگی ہے۔ لہٰذا قاتل بے جا مروت و پاسداری یا ہمدردی کا مستحق نہیں۔

[۲۱۷] یہ حرمت مال کی طرف توجہ دلاتی ہے تاکہ ہر شخص کے اور اس کے بعد اس کے وارثوں کے حقوق متعین و محفوظ ہوں اور دوسرے ان حقوق کا احترام کریں۔

اور قرابت مندوں کے لئے دستور کے مطابق وصیت کی[۲۱۸] خدا سے ڈرنے والوں پر یہ حق ہے ۞ تو جو لوگ اس وصیت کو اس کے سننے کے بعد بدل ڈالیں تو اس کا گناہ ان بدل ڈالنے والوں ہی پر ہے۔ بے شک اللہ سننے والا اور علم رکھنے والا ہے ۞ جس کو کسی وصیت کرنے والے کی طرف سے کسی بے جا جانب داری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو۔ اور وہ آپس میں صلح کرا دے تو اس میں کوئی گناہ نہیں[۲۱۹] بے شک اللہ غفور رحیم ہے ۞

اے ایمان والو، تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے والوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو[۲۲۰] گنتی کے چند دن۔ اس پر بھی جو کوئی مریض ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں تعداد پوری کر دے اور جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکیں ان پر ایک روزے کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا کھلانا ہے[۲۲۱] جو کوئی مزید نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے۔ اور یہ کہ تم روزہ رکھو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، اگر تم سمجھو ۞ ۱۸۴

رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لئے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ، سو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو وہ اس کے روزے رکھے[۲۲۲] اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے

---

[۲۱۸] یہ تقسیم وراثت کا عبوری قانون ہے جس میں مورثوں کو دستور کے مطابق وصیت کی ہدایت ہوئی اور وارثوں کو اس وصیت کی تعمیل کی۔ مستقل قانون سورۃ نساء میں ہے۔

[۲۱۹] یعنی وصیت اگر واضح طور پر جانب داری اور حق تلفی کا پہلو لیے ہوئے ہو تو اس کی اصلاح کے لئے فریقین کے درمیان سمجھوتے اور مفاہمت کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔

[۲۲۰] تمام شریعت کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔ تقویٰ یہ ہوتا ہے جذبات و خواہشات پر قابو پانے کی قوت و صلاحیت ہے، اور اس کی سب سے بہتر تربیت روزوں کے ذریعے ہوتی ہے تاکہ انسان طمع اور اشتعال، غیظ و انتقام، خواہش اور ہیجان کے غیر معتدل رجحانات کو لگام لگا سکے۔ روزہ روح کو آزادی دلانے اور صبر کی اساس فراہم کرنے والی عبادت ہے۔

[۲۲۱] شروع شروع میں مرض یا سفر کی وجہ سے قضا روزوں کی تلافی مسکین کو کھانا کھلا کر ہو سکتی تھی بعد ازاں یہ اجازت آیت ۱۸۵ سے منسوخ ہو گئی۔

[۲۲۲] یعنی قرآن جیسی عظیم نعمت کی شکر گزاری کا تقاضا یہ ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے رمضان کے مہینے کو، جس میں قرآن نازل ہوا، روزوں کے لئے مخصوص فرمایا تاکہ بندے اس میں اپنے نفس کی خواہشات اور شیطان کی ترغیبات سے آزاد ہو کر اپنے رب سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو سکیں۔

تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا[۲۲۳]۔ اور چاہتا ہے کہ تم تعداد پوری کرو اور اللہ نے جو ہدایت بخشی ہے اس پر اس کی بڑائی کرو اور تاکہ تم اس کے شکر گزار ہو ۞ ۱۸۵

اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق سوال کریں تو میں قریب ہوں[۲۲۴] میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ تو چاہیے کہ وہ میرے حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں تاکہ وہ صحیح راہ پائیں ۞ ۱۸۶

تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا جائز کیا گیا۔ وہ تمہارے لئے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لئے بمنزلہ لباس ہو[۲۲۵]۔ اللہ نے دیکھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے تو اس نے تم پر عنایت کی اور تم سے درگزر فرمایا تو اب تم ان سے ملو اور اللہ نے تمہارے لئے جو مقدر کر رکھا ہے اس کے طالب[۲۲۶] ہو اور کھاؤ پیو۔ یہاں تک کہ فجر کی سفید دھاری شب کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ پورا کرو۔ اور جب تم مسجد میں اعتکاف میں ہو تو بیویوں سے نہ ملو۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں تو ان کے پاس نہ پھٹکنا۔ اس طرح اللہ تعالےٰ اپنی آیتیں لوگوں کے لئے واضح کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں ۞ ۱۸۷

اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ اور اس کو حکام رسی کا ذریعہ نہ بناؤ کہ اس طرح دوسرے کے مال کا کچھ حصہ حق تلفی کر کے ہڑپ کر سکو[۲۲۷] دراں حالیکہ تم اس حق تلفی کو جانتے ہو ۞ ۱۸۸

---

[۲۲۳] احادیث میں جو رخصتیں حاملہ، مرضعہ یا پیر فانی وغیرہ سے متعلق بیان ہوئی ہیں، وہ تمام تر اسی اصول پر مبنی ہیں جو مریض یا مسافر کے لئے بیان ہوا ہے۔

[۲۲۴] یہ آیت تمہید ہے ان سوالوں کے جوابات کی جو روزے کے احکام و آداب سے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں ابھرے۔ فرمایا کہ جو آدمی اخلاص و صداقت کے ساتھ کسی حقیقی ضرورت کے لئے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے، خدا اس کی طلب ضرور پوری کرتا ہے۔

[۲۲۵] لباس آدمی کے جسم کے لیے ساتر، زیب و زینت اور سردی گرمی کی سختیوں اور دشمن کے خطرات سے بچانے والا ہے۔ میاں بیوی کے رشتے سے بھی انسان میں حیا پیدا ہوتی ہے، تہذیب و تمدن پروان چڑھتے ہیں اور یہ دونوں شیطان کے حملوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

[۲۲۶] یعنی اولاد کے طالب ہو۔ ازدواجی زندگی کی اصل غایت صرف لذت نہیں بلکہ بقائے نسل ہے۔

[۲۲۷] قانون کی افادیت اسی وقت تک ہے جب تک قانون کے نفاذ کے لئے دیانت دار حکام

وہ تم سے محترم مہینوں[229] کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ دو یہ لوگوں کے فوائد اور حج کے اوقات ہیں اور تقویٰ یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے داخل ہو بلکہ تقویٰ ان کا تقویٰ ہے جو حدودِ الٰہی کا احترام ملحوظ رکھیں۔ گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو[230] اور اللہ سے ڈرتے رہو، تاکہ تم فلاح پاؤ ۞ ۱۸۹

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کریں[231] اور حد سے بڑھنے والے نہ بنو۔ بیشک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا ۞ اور ان کو جہاں کہیں تم پاؤ قتل کرو اور ان کو وہاں سے نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔ اور تم ان سے مسجدِ حرام کے پاس خود پہل کر کے جنگ نہ کرو جب تک وہ تم سے اس میں جنگ نہ چھیڑیں۔ پس اگر وہ تم سے جنگ چھیڑیں تو ان کو قتل کرو، یہی کافروں کا بدلہ ہے[232] ۞ پس اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۞ اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہ جائے[233] اور دین اللہ کا ہو جائے۔ اور اگر یہ باز آجائیں تو پھر اقدام صرف ان کے خلاف جائز ہے

موجود ہیں، اور معاشرہ رشوت کی بیماری سے پاک ہے اس آیت میں رشوت کے ذریعے سے حکام کو خریدنے اور اس چیز کو دوسروں کے حقوق کو غصب کرنے کا ذریعہ بنانے کی ممانعت فرمائی۔

۲۲۸ یہاں سے آگے حج اور جہاد کا بیان ہے۔ حقیقت میں حج بھی جہاد ہی کی ایک قسم ہے۔

۲۲۹ محترم مہینوں سے مراد اشہرِ حرم (ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب) ہیں۔ یہ حج و عمرہ کی سہولت کے لئے مخصوص کیے گئے اور ان میں لڑنا بھڑنا حرام قرار دیا گیا۔ عرب میں معاشی و تجارتی سرگرمیوں کا انحصار بیشتر انہی مہینوں پر تھا۔

۲۳۰ زمانہ جاہلیت میں عربوں کا یہ دستور تھا کہ حج کے لئے احرام باندھ چکنے کے بعد یا سفرِ حج سے واپسی پر ان دروازوں سے داخل نہ ہوتے جن دروازوں سے نکلتے۔ اُن کے نزدیک یہ تقویٰ کا تقاضا تھا۔ یہاں اس بدعت کی اصلاح کر دی۔

۲۳۱ یعنی اشہرِ حرم میں صرف دفاعی جنگ جائز ہے۔

۲۳۲ بیت اللہ کو مشرکین کے قبضہ سے چھڑانا اور اس کو شرک و کفر کی تمام آلائشوں سے پاک کر کے از سرِ نو اس کو توحید و اسلام اور امتِ مسلمہ کا مرکز بنانا رسالتِ محمدی کا نصب العین تھا۔ لہٰذا یہ حکم دیا کہ اس جدوجہد میں اگر قریش مزاحم ہوں تو ان کا مقابلہ کرو۔ ان سے تصادم ہو تو ان کو قتل کرو اور ان کے فتنہ کا استیصال کرو۔ یہ جنگ اس وقت تک جاری رہنی چاہیے جب تک قریش اپنی مخالفانہ و معاندانہ حرکتوں سے باز نہیں آجاتے۔

۲۳۳ فتنہ سے مراد جبر و ظلم سے لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کرنا ہے۔

جو ظالم ہیں ۞ ۱۹۳

شہرِ حرام، شہرِ حرام کا بدلہ ہے اور اسی طرح دوسری محترم چیزوں کا بھی قصاص ہے[234] تو جو تم پر زیادتی کریں تم بھی ان کی زیادتی کے جواب میں اس کے برابر ان کو جواب دو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ یقین رکھو کہ اللہ حدودِ الٰہی کا احترام کرنے والوں کے ساتھ ہے ۞ ۱۹۴

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو تباہی میں نہ جھونکو[235]۔ اور انفاق خوبی کے ساتھ کرو۔ بیشک اللہ خوبی کے ساتھ کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے ۞ ۱۹۵

---

۲۳۴ یعنی جس محترم چیز کے حقوقِ حرمت سے وہ تمہیں محروم کریں، تم بھی اس کے قصاص میں اس کے حقِ حرمت سے انہیں محروم کرنے کا حق رکھتے ہو، البتہ تقویٰ کی حدود کا لحاظ رہے۔

۲۳۵ انفاق کا یہ حکم جہاد کے لئے دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینے سے جی چراتے ہیں وہ درحقیقت اپنے آپ کو ہلاکت کے جہنم میں جھونکتے ہیں۔ انسان کے لئے زندگی اور بقا کا اصل خزانہ خدا کی راہ میں جان و مال کی قربانی میں ہے۔

اصولِ تدبرِ حدیث

امین احسن اصلاحی

سند کی عظمت اور اس کے بعض کمزور پہلو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے ہو کر چند راویوں کے واسطے سے بتدریج کسی شیخ پر منتہی ہوتی ہے۔ اس سلسلۂ روایت کو اس حدیث کی سند کہتے ہیں۔ کسی شیخ سے یہاں مراد وہ شیوخِ حدیث ہیں جو سلسلۂ سند میں سنگِ میل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور جن کے ہاتھوں امتِ مسلمہ میں احادیثِ رسول کے مجموعوں کی جمع و تدوین کا عظیم کارنامہ صدرِ اوّل میں انجام پا چکا ہے، جیسے امام مالکؒ، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم (رحمہم اللہ) وغیرہ۔ کتبِ حدیث کی تدوین کے بعد روایتِ حدیث کی سند کے لیے ان اکابر کو شیخ ماننا حدیث کے طالب علموں کے لیے ناگزیر ہے۔

سلسلۂ روایت میں صحابہ کرامؓ کی جو حیثیت اور مرتبہ و مقام ہے اس کی ضروری وضاحت ہم اس سلسلے کے مضمون 'صحابہؓ اور صحابیت' کے تحت کر چکے ہیں۔ صحابہؓ بہرحال اس امت کے گلِ سرسبد ہیں۔ ان کے متعلق یہ طے ہے کہ وہ جرح و تنقید سے قطعی بالاتر ہیں اور محدثین کا یہ اصول کہ 'الصحابة کلهم عدول' (تمام صحابہ جرح و تعدیل سے بالاتر ہیں)، ان کے بارے میں بالکل ٹھیک ہے۔ اس لیے کہ صحابہؓ کا یہ منصب جو بیان ہوا ہے کہ:

عن عمر بن الخطاب قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اصحابی کالنجوم فبایهم اقتدیتم اهتدیتم [1]

حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے صحابی ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے جس کسی کی بھی پیروی کرو گے راہ یاب ہو گے۔

اس کا یہ تقاضا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کی منسوب کردہ حدیث کے بارے

[1] مشکوٰۃ المصابیح، باب مناقب الصحابۃ

میں [illegible] رکھیں کہ وہ پوری امانت و دیانت کے ساتھ روایت کی گئی ہے اور اس کے بارے میں بلاوجہ کسی شبہ میں نہ پڑیں۔

جہاں تک سلسلۂ روایت کے باقی راویوں کا تعلق ہے وہ سب کے سب تنقید کی زد میں آتے ہیں۔ ان سب کی امانت و دیانت، علمی مرتبہ، حافظہ، دین پر عمل، ہر چیز کو پرکھا جاتا ہے۔ ہر ائمۂ فن کی ان کے بارے میں آراء کو جمع کیا جاتا ہے۔ اس اہتمام کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ روایتِ حدیث میں کوئی خرابی راہ نہ پائے۔ اسی اہم ضرورت نے فنِ اسماء الرجال کی راہ ہموار کی۔

سند کا اہتمام اور فنِ اسماء الرجال کی ایجاد:

علم حدیث کی حفاظت کے لیے سند کا باقاعدہ اہتمام اور فنِ اسماء الرجال کی ایجاد مسلمانوں کا ایک کارنامہ ہے جس میں کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جرح و تعدیل کا یہ فن مسلمانوں کا خاص فن ہے۔ جن لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و احوال کی روایت، تحریر اور تدوین کا کام سرانجام دیا ان راویانِ حدیث میں صحابہ کرامؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ اور بعد کے تیسری صدی ہجری تک کے لوگ شامل ہیں جن کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے اور ملنے والوں میں سے کم و بیش بارہ ہزار اشخاص کے نام اور حالات ہمیں ملتے ہیں۔

ان تمام رواۃِ حدیث کے حالات معلوم کرنے اور ان کے طبقات قائم کرنے میں ہزاروں اکابرینِ امت نے اپنی عمریں کھپا دیں۔ وہ قریہ بہ قریہ پہنچے، راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کی معلومات مہیا کیں اور جو لوگ خود ان کے عہد میں بقیدِ حیات نہیں تھے ان کے ملنے والوں سے یا ان کے توسط سے ان سے اوپر کے لوگوں سے ان کے حالات دریافت کیے اور جس حد تک انسانی امکان میں ہو سکتا تھا ان حاصل شدہ معلومات کی چھان پھٹک کی۔ اس طرح سے وہ عظیم الشان اور فقید المثال فن معرضِ وجود میں آیا جسے فنِ اسماء الرجال کہا جاتا ہے۔ اس کے تحت اصحابِ روایتِ حدیث و آثار کے اسماء، القاب، سوانح، سیرت اور امانت و دیانت کا حال قلم بند کیا گیا، ائمۂ محدثین کی ان کے بارے میں آراء جمع کی گئیں، ان کی جرح و تعدیل کی گئی اور ان کے طبقات کی تعیین کی گئی۔ گویا جس کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کے ساتھ کوئی بات کہنے کی جرأت کی اس کی ساری زندگی نہایت بے لاگ اور بے رحم نقادوں کا ہدف بن گئی، اور آخرت سے پہلے اس کو سارا حساب اسی دنیا میں دینا پڑ گیا۔

اس فن میں اگر کوئی قوم مسلمانوں کی حریف ہو سکتی تھی تو وہ اہل کتاب ہو سکتے تھے۔ لیکن ان کا حال

یہ ہے کہ اس طرح کا انتظام اپنے نبیوں کے اقوال کی حفاظت کے لئے تو درکنار انہوں نے اپنے آسمانی صحیفوں تک کے لیے نہیں کیا۔ وہ اس میدان میں نہایت ہی بے ہنر نکلے۔ ان کی مذہبی کتابوں کی تو وہ حیثیت بھی نہیں ہے جو ہمارے ہاں ہماری تاریخ کی کتابوں کی ہے۔ ہمارے ہاں تاریخ کی بھی روایت ملے گی تو اس کی سند موجود ہوگی اور اس کے لیے کوئی معیار بہرحال مطلوب ہوگا۔ لیکن ان کے ہاں ان کی سب سے بڑی کتاب "کتابِ مقدس" کے لیے بھی یہ اہتمام نہیں تھا۔ اسی طرح انجیلیں حضرت مسیح علیہ السلام کے بعض حواریوں، جیسے لوقا، یوحنا، مرقس وغیرہ سے منسوب تو ہیں لیکن ان کے ان اوّلین راویوں تک کے اپنے حالات کسی کو معلوم نہیں۔ انجیلوں کی روایت حواریوں سے کس کس نے کی، اس کا تو سرے سے تذکرہ ہی نہیں تھا۔ جن قوموں نے اپنے آسمانی صحیفوں کی حفاظت میں کمزوری دکھائی وہ اپنے رسولوں کے اقوال کی حفاظت کا بھلا کیا اہتمام کرتیں!

یہاں یہ نکتہ نہایت اہم اور قابلِ توجہ ہے کہ اس زمانہ میں حدیث کے طالب علموں کو جملہ رواۃِ حدیث کے بارے میں جرح و تعدیل کے لیے بہرحال سلف کی تحقیقات پر ہی قناعت کرنی پڑے گی اور مجرد انہی کی تحقیقات کی کسوٹی پر کسی سند کے راویوں کا درجہ متعین کیا جائے گا۔ چنانچہ اب کسی حدیث کی سند کو متقدمین کی فراہم کردہ انہی معلومات کی روشنی میں جانچا پرکھا جائے گا۔ اس لیے کہ ذرائع تحقیق، مرورِ زمانہ سے، اب معدوم ہو چکے ہیں۔ اس میں ہمارے لیے کوئی نئی رائے قائم کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ ہمارے ان اکابرینِ فن نے تحقیق کی معراج کی بلندیوں کو چھوا ہے اور انسانی امکان کی حد تک اس فن کی خدمت کی ہے۔

روایت کی جانچ کے لیے سند صرف ایک کسوٹی ہے:

سند کو کسی حدیث کے صدق و کذب کے فیصلہ میں ایک اہم، بلکہ اوّلین عامل کی حیثیت حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی حدیث کی تحقیق کے لیے سب سے پہلے اس کی سند ہی پر نظر پڑے گی اور اس کے متن پر غور کرنے سے پہلے اس کی جانچ کرنا پڑے گی۔ اس جائزے کی روشنی میں اس روایت کا درجہ متعین کیا جائے گا۔

سند کی اس اہمیت سے انکار کی کسی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن حدیث کے بعض غالی حامیوں کا یہ خیال ہے کہ کسی حدیث کی صحت کے ثبوت کے لیے مجرد اس کی سند کا علمِ اصول کے معیار پر پورا ہونا کافی ہے یعنی ان کے نزدیک صحتِ حدیث کے لیے صرف سند کی صحت اور اس کا قابلِ اعتماد ہونا فیصلہ کن امر ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ یہ غلو پر مبنی اور محض حسنِ ظن ہے۔ یہ سلف کی ساری تحقیقات

جن کا ہم نے اوپر اجمالی خاکہ پیش کیا، کو گہنا دیتا ہے۔ اس لیے اس مسئلے پر ہم ذرا تفصیلی بحث کریں گے۔

سند کے تمام محاسن، لطائف، عظمت، اہمیت اور اس کے مطابقِ معیار ہونے کے باوجود اس میں بعض ایسے فطری خلا رہ جاتے ہیں جن کی تلافی کے لیے ضروری ہے کہ حدیث کی صحت کو جانچنے کے لیے سند کے سوا بعض دوسرے طریقے بھی اختیار کیے جائیں۔ مجرد سند پر اعتبار کر کے کسی روایت کی صحت اور حسن و قبح کے متعلق پوری طرح سے اطمینان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو آپ مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جب ہمیں کسی درخت کی تحقیق مقصود ہو تو محض اس کی جڑ کی کیفیت کا مطالعہ کافی نہیں ہوگا، بلکہ جڑ کے علاوہ اس کے تنے، ٹہنیوں، پتوں اور پھل پھول وغیرہ کا بھی مکمل جائزہ لینا پڑے گا۔ تب کہیں جا کر اس درخت کے متعلق ہم جامع اور حتمی رائے قائم کر سکیں گے۔

سند کا پہلا خلا:

سند کی تحقیق میں جو خلا باقی رہ جاتے ہیں وہ معمولی غور و تدبر سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ مثلاً پہلا خلا اس میں یہ ہے کہ اپنے تعلق اور علاقہ سے بعید، ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمیوں کے عقیدہ و کردار، ان کے علم و عمل اور ان کے تعلقات و معاملات کی ایسی تحقیق کہ ان کے متعلق یہ طے کیا جا سکے کہ علمِ رسول کے حمل و نقل کے باب میں ان پر اطمینان کیا جا سکتا ہے یا نہیں کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بے شک محدثین نے اس میدان میں بڑی جاں فشانیاں کی ہیں، لیکن یہ کام ہے بہت مشکل! اس نوعیت کی تحقیق اگر ہم اپنے گاؤں یا قصبہ یا شہر کے لوگوں کے بارے میں کرنا چاہیں تو چنداں آسان نہیں چہ جائے کہ ہزاروں میل دور کے لوگوں کے بارے میں جو مختلف ادوار میں پھیلے ہوئے ہوں۔ اس قسم کی تحقیق کے بارے میں محتاط رائے یہ ہو سکتی ہے کہ فی الجملہ ہمیں ان لوگوں کے کوائف معلوم ہیں اور اب ان کی شخصیات مجہول نہیں رہیں۔ ان کے بارے میں کسی رائے کو حتمی یا قطعی کہنا مشکل اور غالباً اپنی معلومات پر ضرورت سے زیادہ اعتماد ہے۔

آدمی کے کردار و اخلاق کے معاملہ میں قابلِ اطمینان رائے اسی صورت میں قائم کی جا سکتی ہے جب معاملات میں اس سے عملاً سابقہ پڑا ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے صاحبِ علم و فراست کی رائے یہی ہے۔ ان کی نسبت مشہور ہے کہ ایک صاحب نے ان کے سامنے کسی دوسرے شخص کی تعریف کی تو انھوں نے دریافت فرمایا کہ کیا تمہارا اس کے ساتھ کبھی پڑوس رہا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ تب انھوں نے پوچھا کیا تم نے اس کے ساتھ کوئی تجارتی سفر کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ

نے فرمایا کہ تب تمہیں اس کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک آدمی کسی کے ساتھ کوئی معاملہ نہ کرے، اس کے ساتھ کسی کاروبار یا تجارت میں شریک نہ رہا ہو، اس کے ساتھ سفر نہ کیا ہو، اس کا پڑوسی نہ رہا ہو، مسجد میں ایک دوسرے سے میل ملاپ نہ رہا ہو، دیگر دنیاوی معاملات میں ایک دوسرے سے تعاون نہ رہا ہو، ربط ضبط کا ماحول نہ رہا ہو تو اس کے بارے میں واقعہ یہ ہے کہ آسانی کے ساتھ رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ ان حالات میں بعض اوقات ایک ذہین و فطین آدمی بھی دھوکا کھا سکتا ہے۔

سند کا دوسرا خلا :

سند کی تحقیق میں دوسرا خلا جرح و تعدیل کے کام کی نزاکت سے پیدا ہوتا ہے۔ ہر محقق یہ نہیں جانتا کہ جرح کس چیز پر ہونی چاہیے اور تعدیل کس چیز کی ہونی چاہیے۔ یعنی یہ جاننا کہ کیا باتیں جرح کے حکم میں داخل ہیں اور کیا باتیں تعدیل کے مقتضیات میں سے ہیں ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ کردار کی اساسات کیا ہیں، بدکرداری کی بنیادیں کیا ہیں؛ یہ چیزیں اتنی آسان نہیں کہ ہر خاص و عام اس کا کماحقہٗ ادراک کر سکے۔ اس بے خبری کی مثالیں ماضی میں رہی ہیں اور خود مشائخ نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ موجودہ دور کے غلو تے عقیدت و نفرت سے اس مشکل کا ایک سرسری اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جرح و تعدیل کا کام علم، فقاہت، بصیرت، تجربے اور معقولیت کا متقاضی ہے۔ انسان ہمیشہ انسان ہی رہے ہیں؛ فرشتے نہیں رہے ہیں۔ فنِ اسماء الرجال کے ماہرین کا معیارِ اخلاق، بصیرت و بصارت بے شک ہم سے اونچا رہا ہے، لیکن وہ بہرحال آدمی ہی تھے۔ رواۃِ حدیث کے متعلق ان کی فراہم کردہ معلومات اور ان پر مبنی آرا عام انسانی جبلت میں موجود تعصب کے شائبہ سے پاک نہیں ہو سکتیں جو حق یا مخالف، دونوں صورتوں میں پایا جاتا ہے۔

جرح و تعدیل کے فن کے مقتضیات میں سے ہے کہ کسی کے متعلق معلومات فراہم کرنے والا شخص جچا تلا آدمی ہونا چاہیے اور اس سے زیادہ جچا تلا، متوازن اور زیرک اس کو ہونا چاہیے جو جرح و تعدیل کرتا ہے۔

ہمارے نزدیک جرح و تعدیل کے کام کی مشکلات کا لحاظ کرتے ہوئے محتاط طرزِ عمل یہ ہے کہ سلسلۂ روایت یعنی سند کے راویوں کے متعلق اس فن کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں فی الجملہ ایک رائے قائم کی جائے، لیکن اس رائے کو قطعیت کا یہ رنگ نہیں دیا جا سکتا کہ کسی حدیث کی صحت کا معیار اسی رائے کو ٹھہرا لیا جائے۔

سند کا تیسرا خلا :

سند کی تحقیق میں تیسرا خلا یہ ہے کہ ہمارے ائمہ نے اہلِ بدعت، خصوصاً شیعہ اور روافض سے روایات کے معاملے میں بڑی مسامحت برتی ہے۔ یہ لوگ دوسرے معاملات میں تو بڑے بیدار ثابت ہوئے لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں انھوں نے واقعی چشم پوشی سے کام لیا۔ امام مالک علیہ الرحمۃ سے البتہ کسی حد تک اس معاملے میں احتیاط منقول ہے، لیکن دوسرے تمام ائمہ؛ امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابوحنیفہ، قاضی ابویوسف، امام مسلم علیہم الرحمۃ وغیرہ کے متعلق صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات اہلِ بدعت سے روایات لینے میں کوئی قباحت نہیں خیال کرتے تھے۔ بس اتنی احتیاط ملحوظ رکھی کہ ان کے خیال میں وہ اپنی بدعت کا باقاعدہ داعی نہ ہو۔ گویا ان کے نزدیک محض بدعتی سے روایات لینے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ازروئے قرآن، ازروئے حدیث اور حدیث کے مجموعی مزاج کے تقاضے کے لحاظ سے مجرد اہلِ بدعت کے گروہ سے ہونا ضعف کے لیے کافی ہے، اگرچہ راوی اپنی بدعت کا داعی نہ رہا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیعیت، رفض، باطنیت اور اس قبیل کے دوسرے مذاہب اصل دین سے انحراف پر قائم ہیں۔ اپنے مذہب کو ثابت کرنے کی خاطر جب تک یہ اصل دین میں جھوٹ نہ بولیں تو اپنا گروہی فریضہ نہیں ادا کرتے۔ انہیں اپنی بدعت کے حق میں دلیل فراہم کرنے کے لیے روایات کے بنانے کی ضرورت پڑتی ہے اور ان کے لیے روایات میں خیانت کے سوا کوئی چارہ نہیں کیوں کہ ان کے مذاہب بہرحال بدعت ہی کے اوپر قائم ہیں، کسی ماثور حقیقت کے اوپر قائم نہیں ہیں۔ سوادِ امت سے ان فرقوں کا اختلاف کسی ایک آدھ آیت یا چند حدیثوں کی توجیہ میں نہیں ہے، بلکہ بیشتر دین کے فلسفہ میں اختلاف ہے۔ جس سے ان کا مذہب بالکل الگ ہو گیا ہے۔ اب اگر کسی کو ان فرقوں کے ساتھ صلح کل کے فلسفے کو نبھانا اور بھائی چارہ اور دوستی قائم کرنا ہو تو وہ ضرور ایسا کرے، لیکن دین کے معاملے میں اس باطل فلسفے کو راہ نہیں دی جا سکتی۔

ہمارے نزدیک اہلِ بدعت کی روایات قبول کرنے کی یہ گنجائش فتنوں کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے اور ماضی میں اس کا باعث بنی ہے۔ مجرد کسی کا مبتدع ہونا اس کے ساقط الروایۃ ہونے کے لیے کافی ہے اور ان فرقوں میں سے کسی کی روایت قابلِ قبول نہیں ہونی چاہیے خواہ وہ

قسم کھا کے روایت کرے کہ میں سچ ہی روایت کروں گا۔ ہمارے نزدیک یہی صحیح مسلک ہے جو قرآن و سنت کے مطابق ہے۔

سند کا چوتھا خلا:

سند کی تحقیق میں چوتھا خلا یہ ہے کہ ہمارے اکابر حدیث نے حلال و حرام کے متعلق حدیثیں قبول کرنے میں فی الجملہ احتیاط برتی ہے، لیکن ترغیب و ترہیب اور فضائل وغیرہ کی روایات میں انھوں نے عمداً تساہل برتا ہے۔ الکفایۃ فی علم الروایۃ میں امام احمد بن حنبل کا قول نقل ہوا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

اذا روینا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الحلال والحرام والسنن والاحکام تشددنا فی الاسانید واذا روینا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی فضائل الاعمال وما لا یضع حکماً ولا یرفعہ تساھلنا فی الاسانید۔[1]	جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حلال و حرام اور سنن و احکام کے بارے میں روایت کرتے ہیں تو سند کے معاملے میں پوری احتیاط برتتے ہیں، لیکن اگر معاملہ فضائلِ اعمال وغیرہ کا ہو جس سے نہ کوئی حکم قائم ہوتا ہو نہ کوئی حکم منسوخ ہوتا ہو تو اس کی سند میں ہم تساہل برتتے ہیں۔

گویا محدثین نے سند کی صحت کو صرف ان روایات کے ضمن میں درخورِ اعتنا سمجھا جن میں کسی نوعیت کے احکام تھے ترغیب و ترہیب کی کمزور روایات کو مفید سمجھا گیا کہ ان کے باعث لوگ نیکی کی طرف رجوع کریں۔ فضائل کی روایات سے بھی نیکی کے عمل کو مہمیز ملتی تھی۔ اس لیے ان کو سند کے ضعف کے باوجود کتابوں میں جگہ دے دی گئی۔ لیکن ہمیں یہ جائزہ لینا چاہیے کہ آیا محدثین ایسا کرنے میں حق بجانب تھے یا نہیں۔

نہایت عمیق مطالعے اور غور و فکر کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جہاں تک اہلِ تصوف کے اصل دین سے انحراف پر مبنی خیالات اور تصوراتِ اعمال کا تعلق ہے یہ بیشتر محدثین کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے کمزور روایات کا ایک دفتر کھول دیا جس سے من پسند تصوراتِ دین نے جنم لے لیا۔

[1] الکفایۃ فی علم الروایۃ، باب التشدد فی احادیث الاحکام والتجوز فی فضائل الاعمال: ص ۱۳۴۔

گویا اعمال و اصلاحِ اعمال تک ہی محدود نہ رہا بلکہ ان روایات سے عقائد بھی متاثر ہوئے اور یہ سلسلہ اس قدر بڑھا کہ دین کے نام سے نئے عقائد، نئے اعمال اور نئے اخلاق اختیار کر لیے گئے۔ جب اہلِ تصوف کے اس انحراف اور بگاڑ کو محدثین نے ان کی سراسر زیادتی قرار دیا اور ان کے خیالات پر گرفت کی تو معلوم ہوا کہ پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اس لیے جواب میں انہیں یہ طعنہ دیا گیا کہ محدثین کا کام تو راویوں کی غیبت کرنا ہے اور ان کا جرح و تعدیل کا کام اس حرام کام کے ارتکاب پر مبنی ہے۔ تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ تصوف نے محدثین کے انتباہ کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اس طرح محدثین کا یہ خیال کہ اگر وہ حلال و حرام اور سنن و احکام کے بارے میں احتیاط کر لیں گے اور ترغیب و ترہیب اور فضائلِ اعمال وغیرہ سے متعلق روایات میں تساہل برت لیں گے تو امت پر اس کے برے اثرات نہ پڑیں گے، اصلاً غلط بلکہ مہلک ثابت ہوا۔

فی الحقیقت روایات میں اس تساہل کے نتیجے میں کمزور روایات کی بھرمار تصوف کی کتابوں میں ہو گئی ہے اور ان سے دین کا تصور جس قدر مسخ ہوا ہے وہ مخفی نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ ان کی بدولت دین کا ایک متوازی تصور قائم ہو گیا جس کی بنیاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عمل میں کہیں نہیں تھی۔

ماحصلِ بحث:

کسی حدیث کے صدق و کذب کے فیصلے میں سند کے ایک اہم عامل ہونے سے انکار کی مجال کسی کے لیے نہیں ہے لیکن اس کے لطائف، محاسن، عظمت اور اس کے مطابق معیار ہونے کے باوجود سند کی تحقیق میں بعض ایسے خلا رہ گئے ہیں جن کے باعث سند کو روایت کی صحت کے جانچنے کا واحد ذریعہ قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ یہ ضروری ہے کہ تحقیقِ حق کے لیے آج بھی نہ صرف سند کو مزید پرکھنے کی کوشش کی جائے بلکہ اس کے علاوہ وہ تمام فطری طریقے اختیار کیے جائیں جن سے روایت کی حیثیت متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہو۔

(ترتیب: ماجد خاور)

تدبرِ حدیث
خالد مسعود

عورت کے کردار کے چند قابلِ اصلاح پہلو

عن عبد اللہ بن عمر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال یا معشر النساء تصدقن واکثرن الاستغفار فانی رأیتکن اکثر اہل النار فقالت امرأۃ منہن جزلۃ ومالنا یا رسول اللہ اکثر اہل النار قال تکثرن اللعن وتکفرن العشیر وما رایت من ناقصات عقل ودین اغلب لذی لب منکن قالت یا رسول اللہ وما نقصان العقل والدین قال اما نقصان العقل فشہادۃ امرأتین تعدل شہادۃ رجل فہذا نقصان العقل وتمکث اللیالی ما تصلی وتفطر فی رمضان فہذا نقصان الدین۔

(مسلم، باب بیان نقصان الایمان بنقص الطاعات)

عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے گروہِ خواتین، صدقہ کیا کرو، اور کثرت سے استغفار کیا کرو کیونکہ میں نے دوزخیوں میں تم عورتوں کی اکثریت دیکھی ہے۔ اس پر اس گروہ کی ایک دانش مند خاتون بولیں، یارسول اللہ، ہماری کیا خطا ہے کہ دوزخیوں میں ہماری اکثریت ہے؟ آپ نے فرمایا، آپؐ نے فرمایا تم بہت لعن طعن کرتی ہو، شوہر کی ناشکری کرتی ہو اور عقل و دین کی کمی رکھتے ہوئے میں نے تم سے زیادہ کسی کو بیدار مغزوں کو مغلوب کرنے والا نہیں پایا۔ خاتون نے کہا، "یارسول اللہ، عقل و دین کی کمی سے کیا مراد ہے؟" آپ نے فرمایا "عقل کی کمی پوچھتی ہو تو دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار پاتی ہے تو یہ عقل کی کمی کی دلیل ہوئی۔ اور یہ جو کئی روز اس حال میں رہتی ہے کہ نماز نہیں پڑھتی اور رمضان میں روزہ

چھوڑتی ہے تو یہ دین کا نقصان ہوا۔"

روایت کے دوسرے طُرق :

یہ روایت کئی صحابہ سے مروی ہے۔ امام مسلمؒ نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے جو روایت کی ہے وہ خواتین سے آنحضرتؐ کے خطاب کے موقع کو بھی واضح کرتی ہے۔

عن جابر بن عبد اللہ قال شہدت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصلوۃ یوم العید فبدأ بالصلوۃ قبل الخطبۃ بغیر اذان ولا اقامۃ ثم قام متوکأ علی بلال فامر بتقوی اللہ وحث علی طاعتہ ووعظ الناس وذکرہم ثم مضی حتی اتی النساء فوعظہن وذکرہن فقال تصدقن فان اکثرکن حطب جہنم فقامت امرأۃ من سطۃ النساء سفعاء الخدین فقالت لم یا رسول اللہ قال لانکن تکثرن الشکاۃ وتکفرن العشیر قال فجعلن یتصدقن من حلیہن یلقین فی ثوب بلال من اقرطہن وخواتمہن۔ (مسلم۔ کتاب صلوۃ العیدین)

"جابرؓ بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ میں عید کے دن رسول اللہؐ کے ساتھ نماز میں حاضر تھا۔ آپؐ نے خطبہ سے پہلے اذان اور اقامت کے بغیر نماز سے آغاز کیا۔ پھر آپؐ بلالؓ کا سہارا لے کر کھڑے ہوئے۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین فرمائی، خدا کی اطاعت پر اُبھارا اور لوگوں کو تنبیہ اور نصیحت کی۔ اس کے بعد آپؐ چلے یہاں تک کہ خواتین کی صفوں کے پاس پہنچے۔ آپؐ نے اُن کو بھی تنبیہ اور نصیحت کی اور فرمایا: "صدقہ کیا کرو کیونکہ تم خواتین کی اکثریت جہنم کا ایندھن ہوگی۔ اس پر ایک سنگیے گالوں والی دانشمند خاتون کھڑی ہوئی اور عرض کی: "یارسول اللہؐ ایسا کیوں ہوگا؟" آپ نے فرمایا "یہ اس لیے کہ تم شکایتیں بہت کرتی ہو اور شوہر کی ناشکری کرتی ہو۔" جابرؓ کہتے ہیں کہ اس پر خواتین اپنے زیورات صدقہ کے طور پر دینے لگ گئیں۔ وہ اپنے آویزے اور انگوٹھیاں بلالؓ کی چادر میں ڈالے جا رہی تھیں۔"

جابر بن عبداللہؓ کی اس روایت سے واضح ہوا کہ عید کی نماز پڑھانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا تو شاید یہ محسوس فرما کر کہ مسجد کے پچھلے حصے میں خواتین تک آواز نہ پہنچی ہوگی آپ نے خواتین کی صفوں کے قریب جا کر ان سے خاص طور پر خطاب فرمایا جس میں صدقہ اور استغفار

کی کثرت کی انہیں تلقین فرمائی۔

امام بخاریؒ نے یہ حدیث حضرت ابو سعید خدریؓ کے واسطہ سے نقل کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عید کے موقع پر آنحضرتؐ کے مردوں سے خطاب کا موضوع بھی صدقہ کی تلقین ہی تھا اور یہی بات آپ نے عورتوں کے اجتماع سے بھی کی۔ جس کے نتیجہ میں انھوں نے اپنے زیورات اتار کر بلالؓ کی جھولی میں ڈال دیئے۔ اس روایت کے مطابق خواتین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کیئے جبکہ مُسلم کی روایات صرف ایک خاتون کا حوالہ دیتی ہیں اور یہی بات قرینِ قیاس بھی نظر آتی ہے کہ ایک دانش مند خاتون نے جرأت کر کے وضاحت چاہی ہوگی۔ جس کے جواب میں آنحضرتؐ نے عورتوں کے جہنم میں جانے کے اسباب کی وضاحت فرمائی۔

وضاحتِ حدیث :

کتبِ حدیث میں ایک روایت یوں وارد ہے کہ ایک مرتبہ سورج گرہن ہُوا۔ اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طویل نماز پڑھائی۔ نماز کے دوران میں صحابہ نے دیکھا کہ آنحضرتؐ نے ہاتھ بڑھایا جیسے کوئی چیز پکڑنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد آپ پیچھے کو ہٹے جیسے کسی چیز سے بچنا چاہتے ہیں۔ نماز کے بعد صحابہؓ نے اس کی وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ اس وقت مجھے جنت اور دوزخ کی سیر کرائی گئی تھی، میں نے جنت کے خوشوں میں سے ایک خوشہ توڑنا چاہا اور اس مقصد کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اسی طرح دوزخ کی سیر کے وقت اس کی لپیٹ سے اپنے آپ کو دُور رکھنے کے لیے میں ہٹ گیا۔ دوزخیوں میں مجھے عورتوں کی اکثریت نظر آئی۔ اس روایت کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ صدر حدیث میں رأیتکن اکثر اھل النار میں جس رویت کا ذکر ہے وہ وہی ہے جو صلوٰۃ کسوف میں آپؐ کو حاصل ہوئی تھی اس مشاہدہ کو آپ نے بعد میں آنے والی نماز عید کے خطبہ میں بیان فرمایا تاکہ خواتین اس سے عبرت حاصل کریں۔ ممکن ہے کسی شخص کو یہ خیال ہو کہ آنحضرتؐ کو یہ رویت کیسے حاصل ہو گئی، جب کہ قیامت ابھی قائم نہیں ہوئی؟ یہاں یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ رسولؐ اللہ تعالیٰ کی جانب سے لوگوں کی ہدایت پر مامور ہوتا ہے۔ اس کا کام لوگوں پر دین کی حجت تمام کرنا اور مومنین میں امورِ غیب کا یقین پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ کام اسی وقت سہل ہو سکتا ہے جب خود رسول کو ان امور کے بارے میں عین الیقین حاصل ہو۔ لہٰذا اللہ تعالےٰ عالمِ مثال میں نبی کو ان حقائق کا مشاہدہ کرا دیتا ہے جو غیب سے تعلق رکھتے ہوں یا ابھی پیش آنے والے ہوں۔ بعض انبیاء کے اس طرح کے مشاہدات کا ذکر قرآنِ مجید میں ہے اور آنحضرتؐ

کا واقعہ معراج بھی اسی تعلیم کی ایک کڑی تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ صلوۃ الکسوف کے دوران عالمِ مثال میں آپ کو جنت اور دوزخ کے حقائق سے باخبر کیا گیا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ پر جن خاتون نے عورتوں کے بکثرت دوزخ میں جانے کے اسباب کی بابت سوال کیا، ان کا نام شارحین حدیث نے اسماء بنتِ یزید بیان کیا ہے۔ ان کا سوال نہایت برمحل تھا۔ اس کے جواب میں رسول اللہ کی زبان سے عورت کی ان کمزوریوں کا خلاصہ سامنے آگیا جو اس کی عاقبت کو خراب کرنے والی ہیں۔ آنحضرتؐ کے جواب پر غور کرنے سے تین اسباب متعین ہوتے ہیں۔

لعن طعن کی عادت :

پہلا سبب آپؐ نے یہ بتایا کہ تکثرن اللعن (تم بکثرت لعنت کرتی ہو) لعنت سے مراد کسی کو دھتکارنا، مردود قرار دینا اور اس کے لئے خدا کی رحمت سے محرومی کی انتہائی سخت بددعا کرنا ہے۔ یہ معمولی سرزنش کا لفظ نہیں بلکہ کسی سے نفرت کے اظہار کا آخری لفظ ہے۔ جابرؓ کی روایت کے مطابق حضورؐ نے تکثرن الشکاۃ (تم شکایت کی بھرمار کرتی ہو) کے الفاظ فرمائے۔ شکایت اور لعن طعن ایک ہی رویہ کی ابتدا اور انتہا کو ظاہر کرتے ہیں اور یہ رویہ مردم بیزاری اور حق تلفی پر مبنی ہے۔ عورتیں عموماً نہایت حساس اور زود رنج ہوتی ہیں۔ وہ اپنے مزاج کے خلاف کسی چیز کو آسانی سے برداشت نہیں کرتیں۔ اپنی برہمی کے اظہار میں وہ پیش و عقب کا خیال نہیں رکھتیں۔ معاملات پر ٹھنڈے مزاج سے غور کرنے کے بجائے وہ مخالف فریق پر ہر اینٹ پتھر پھینک کر انتقام لینا چاہتی ہیں۔ وہ نہ صرف اسے بلکہ اس کے اگلے پچھلوں سب کو بددعا کا نشانہ بناتی ہیں جس سے بے گناہ لوگوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ زبان جب لعن طعن سے آشنا ہو جاتی ہے تو اکثر عورتیں اپنی محرومیوں اور مشکلات میں خداوند تعالےٰ کو بھی بُرا بھلا کہنے سے باز نہیں آتیں۔ اس طرح خداوند سے بیزاری اور انسانی حقوق کی ناقدری ان کی عاقبت کو خراب کر دیتی ہے۔

احسان ناشناسی :

عورتوں کی دوسری کمزوری آنحضرتؐ نے یہ بیان فرمائی کہ تکفرن العشیر (تم شوہر کی ناشکری کرتی ہو) صلوٰۃ الکسوف کے ضمن میں جو روایت حدیث کی کتابوں میں ہے اس میں ناشکری کی مزید وضاحت بھی حضورؐ نے فرمادی۔ روایت کا متعلقہ حصہ یوں ہے:

عن عبد اللہ بن عباس ...... قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رأیت

النار فلم ار کالیوم منظراً قط افظع ورأیت اکثر اھلھا النساء قالوا لم یارسول اللہ قال بکفرھن قیل ایکفرن باللہ قال ویکفرن العشیر ویکفرن الاحسان لو احسنت الی احداھن الدھر کلہ ثم رأت منک شیئاً قالت ما رأیت منک خیراً قط۔ (موطا۔ باب العمل فی صلوٰۃ کسوف الشمس)

عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں......... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں نے دوزخ دیکھی اور آج جس قدر ڈراونا منظر میں نے دیکھا ویسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے دوزخ کے باسیوں میں زیادہ تر عورتوں کو دیکھا"۔ صحابہ نے پوچھا "یارسول اللہ، وہ کیوں؟" آپ نے فرمایا "ان کی ناشکری کے سبب سے"۔ پوچھا گیا "کیا وہ اللہ کی ناشکری کرتی ہیں"؟ آپ نے فرمایا "ہاں اور شوہر کی ناشکری کرتی ہیں، احسان کی ناشکری کرتی ہیں، کسی پر زندگی بھر احسان کرتے رہیے، پھر بھی اگر کوئی کوتاہی دیکھے گی تو کہہ دے گی کہ میں نے کبھی تجھ سے بھلائی نہیں دیکھی"۔

یعنی بیشتر خواتین احسان ناشناس ہوتی ہیں۔ ان کا یہ رویہ خدا کے ساتھ بھی ہوتا ہے، شوہر کے ساتھ بھی اور ہر احسان کرنے والے کے ساتھ بھی۔ کوئی شخص زندگی بھر ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے لیکن اگر کبھی اتفاق سے یا بعض مجبوریوں کے تحت اس سے کوتاہی ہو جائے گی تو عورتیں اس کی مجبوری کا احساس یا کوتاہی کو نظر انداز نہیں کریں گی بلکہ سیدھے سیدھے اس کو الزام دے دیں گی، جیسے کبھی انھوں نے اس سے کوئی خیر دیکھی ہی نہیں۔

خواتین شوہر کے ساتھ اپنے اس رویہ سے تمکنت کا اظہار کرتی ہیں اور اس میں بہت کچھ دخل اپنی حیثیت پر ناز اور شوہر پر اعتماد کو ہوتا ہے۔ لیکن کوئی بھی جذبہ جب مفرط ہو جائے اور اس میں آدمی صحیح و غلط اور حق و ناحق میں تمیز نہ کر سکے تو اس سے مفاسد پیدا ہوتے ہیں، اس لیے اس سے اجتناب ضروری ہوتا ہے۔ احسان مندی فطرت سلیم کا تقاضا ہے۔ انسان تو اشرف المخلوقات ہے کتے اور بلی کے ساتھ کوئی احسان کیجئے تو وہ دُم ہلا کر اپنی احسان مندی کا اظہار کرے گی۔ انسان کے اندر یہ جذبہ نہ پایا جائے تو وہ انتہائی خود غرض اور مطلب پرست ہوگا۔ پس احسان ناشناسی وہ کمزوری ہے جسے انسان اپنی اچھی فطرت کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے ہی اپنا سکتا ہے۔

زندگی ایک امتحان ہے۔ اس میں نرم و سخت اور سرد و گرم دونوں طرح کے حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہمیں ہر وقت میسر ہوتی ہیں لیکن کبھی کبھار وہ انہیں روک کر ہمارا امتحان لیتا

ہے۔ زندگی کا صحیح رویہ یہ ہے کہ بندہ ہر حال میں رب کا شکر گزار ہو اور جب امتحان پیش آجائے تو رب ہی کی طرف مدد کے لیے رجوع کرے۔ مشکلات پر صبر کرے اور زبان پر حرف شکایت نہ لائے۔ اسی طرح بیوی کے ساتھ شوہر کا عمومی رویہ محبت اور ہمدردی پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ اس کی ضروریات کا لحاظ رکھتا ہے۔ گھر کی آسودگی کی خاطر محنت اور جفا کشی سے کام کرتا ہے۔ کبھی کبھار یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بیوی کی کوئی تمنا پوری نہ کر سکے یا اُسے مناسب نہ سمجھتا ہو یا اس کے وسائل ناکافی ہوں۔ عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ بیوی کے اندر شوہر کے عمومی رویہ کے مطابق احسان مندی کے جذبات ہوں اور اگر اس کی مجبوریوں یا کوتاہیوں سے اُسے سابقہ پڑے تو ان سے درگزر کرنے میں وہ فراخ دل واقع ہو۔

انسان کی اصل خوبی زندگی میں توازن پیدا کرنا، اور ہر معاملے کو اس کی واقعی اہمیت دینا ہے۔ اس میں اگر کوتاہی ہو جائے تو حقوق تلف ہونے لگتے ہیں، خواہ وہ خدا کے ہوں یا بندوں کے۔ قرآن نے سورۃ الفجر میں انسان کی اس کمزوری کو بے نقاب کیا ہے، فرمایا:

اَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ	انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا رب اُسے
رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ	آزمائے، اس کو عزت اور نعمت دے تو کہتا ہے
رَبِّيْۤ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّاۤ اِذَا مَا	میرے رب نے مجھے عزت دی۔ لیکن جب وہ
ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ	اُسے آزمائے اور رزق کی تنگی دے تو کہتا ہے
رَبِّيْۤ اَهَانَنِ ۝ (فجر ۱۵۔۱۶)	میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔

قرآن مجید نے یہ واضح کیا ہے کہ صحیح رویہ اس شخص کا ہے جو نعمت ملنے پر شکر گزار اور تنگی ترشی کی حالت میں قانع و صابر ہو۔ اسی شخص کو اطمینانِ قلب نصیب ہو سکتا ہے اور اسی کے لیے بشارت ہے کہ وہ خُدا کے پسندیدہ بندوں میں ہوگا اور جنت میں داخل ہوگا۔ ناشکرے اور بے صبرے انسان اس بشارت کے لائق نہیں اور یہی حقیقت حضورؐ نے عورتوں سے ارشاد فرمائی۔

فتنہ سامانی:

عورتوں کی اکثریت کے جہنم میں جانے کا تیسرا سبب آنحضرتؐ نے یہ بیان فرمایا کہ میں نے عقل و دین کی کمی کے ساتھ تم عورتوں سے زیادہ کسی کو بیدار مغز مردوں کو مغلوب کرنے والا نہیں پایا۔ بخاریؒ کی روایت کے الفاظ ہیں: ما رأیت من ناقصات عقل و دین اذھب للب الرجل الحازم من احداکن (میں نے تم سے زیادہ کسی کو عقل و دین میں ناقص ہونے کے باوجود

ایک محتاط مرد کی عقل کو سلب کرنے والی نہیں دیکھا) آنحضرتؐ نے اس جملہ میں عورت کی زبردست صلاحیتوں اور قوتِ تسخیر کا اعتراف کیا ہے کہ وہ اپنی تدبیر، طبیعت، ناز، وفاداری، محبت اور نہ جانے کن صفات کو بروئے کار لاکر بڑے سے بڑے ہوشیار اور محتاط و بیدار مغز مرد کی رائے پر اثر انداز ہو کر اُسے اپنے ڈھب پر لے آتی ہے کیونکہ بقولِ اقبال :

؎ کہ مرد سادہ ہے' بے چارہ زن شناس نہیں

عورت کی قوتِ تسخیر بذاتِ خود بُری چیز نہیں بلکہ ایک اعلیٰ صلاحیت ہے، بُری چیز اس قوت کا غلط استعمال اور اس کی فتنہ سامانی ہے۔ عورت جب اس قوت کے نشہ میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا لحاظ نہیں کرتی، اس قوت کو باطل کے لئے صرف کرتی ہے، اور اپنی مطلب براریوں کے لئے دوسروں کو آلۂ کار بنا لیتی ہے تو وہ نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنے شوہر اور عزیزوں کے لیے بھی جہنم کا سامان کر لیتی ہے۔ اس کے اس کردار کی طرف قرآن مجید نے بھی توجہ دلائی جب فرمایا :

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ	اے ایمان والو! تمھاری بیویوں اور اولاد
وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ	میں تمھارے دشمن بھی ہیں ان سے بچ کر رہو۔
فَاحْذَرُوْهُمْ۔ (تغابن : ۱۴)	

اور آنحضرتؐ نے فرمایا ما ترکت بعدی فی الناس فتنۃ اضر علی الرجال من النساء (مسلم۔ کتاب الرقاق) میں نے اپنے بعد لوگوں میں مردوں کے لیے عورتوں کے فتنہ سے زیادہ ضرر رساں فتنہ نہیں چھوڑا۔

جس طرح ہر جسمانی بیماری کا اللہ تعالےٰ نے کوئی نہ کوئی علاج پیدا کر رکھا ہے، اِسی طرح اخلاقی کمزوریوں کو دور کرنے کے طریقے بھی اس نے پیدا کئے ہیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ کرنے کے بعد دو باتوں کی تلقین فرمائی جس سے وہ اپنی کمزوریوں کا علاج کر سکتی اور اپنی عاقبت کو سنوار سکتی ہیں۔ آپ نے فرمایا: کثرت سے استغفار اور صدقہ کرو۔" استغفار بندے کو اس کی کوتاہیوں کی طرف متوجہ اور اس بات کی یاد دہانی کرتا ہے کہ ایک اعلیٰ و برتر ذات ایسی ہے جو بندے کی کمزوریوں سے آگاہ ہے اور اس کو ان کی سزا دے سکتی ہے۔ لہٰذا استغفار اس غرور، تمکنت اور ناز کا علاج ہے، جو عورت کو بے اعتدالی، ناشکری اور حق تلفی کی راہ پر ڈالتا ہے۔ صدقہ دین کی تعلیمات پر بندے کو جمائے رکھتا اور نیکی کی راہ پر چلنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ آنحضرتؐ نے خواتین کو استغفار اور صدقہ کے ذریعے اپنی اصلاح کرنے کی تلقین فرمائی اور روایت میں ہے کہ انھوں نے فی الفور اس پر عمل کیا اور حضرت بلالؓ کی چادر میں اپنے زیورات ڈالنے لگیں۔

عورت کی مذکورہ بالا کمزوریاں، جب کہ واضح کیا گیا، اس کی فکرمندی، زود رنجی، تمکنت، ناز اور قوتِ تسخیر وغیرہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی ان صفات کا اس کے فرائض زندگانی سے عہدہ برا ہونے میں بڑا دخل ہے اور وہ ان کے ذریعے سے بڑے اعلیٰ مقاصد کو پورا کرتی ہے بشرطیکہ ان کو صحیح محل پر استعمال کرے۔ اچھی سے اچھی صفت جب غلط محل پر بروئے کار لائی جائے تو وہ فتنہ بن جاتی ہے۔ اس غلطی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرمایا اور عورتوں کو توجہ دلائی کہ وہ ان صفات کو اپنی کمزوری نہ بننے دیں کیونکہ اس کے نتیجہ میں وہ اسفل سافلین میں جاگریں گی اور اگر وہ ان صفات کو ان کی حدود میں رکھیں گی اور اپنی اصلاح کرتی رہیں گی تو آخرت میں اپنے درجات بلند کر سکتی ہیں۔

عقل و دین کا نقصان :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عورتوں کو ناقصات العقل والدین فرمانا یہ واضح کرنے کے لیے تھا کہ اپنی فطری ساخت اور خصوصیات کے لحاظ سے مرد کے بالمقابل ایک کمزور جنس ہونے کے باوجود عورت یہ صلاحیت رکھتی ہے کہ دانا سے دانا مرد کو رام کرے۔ کمزور جنس ہونے کی دلیل کے طور پر آپؐ نے جو وضاحت فرمائی اس سے آپؐ کا اشارہ عقل اور دین دونوں میدانوں میں اس کی کم تر ذمہ داریوں کی طرف تھا جو شریعت نے اس پر ڈالی ہیں اسی لیے جب خاتون نے وضاحت چاہی تو آپؐ نے فرمایا: دیکھتی نہیں ہو کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے اور ہر مہینے میں کتنے ایام ایسے آتے ہیں جن میں اسے نماز روزے کا پابند نہیں کیا گیا۔ اول الذکر میں اشارہ قرآن مجید کے اس حکم کی طرف ہے جس میں فرمایا ہے کہ قرض کے لین دین پر دو مردوں کو گواہ کر لیا کرو۔ اگر دو مرد میسر نہ ہوں تو ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کو گواہ کر لو تاکہ وہ معاملہ کی نوعیت ایک دوسری کو یاد دلا کر گواہی کی ضرورت کو پورا کر سکیں۔ موخر الذکر میں حیض کے دنوں کی ان سہولتوں کی طرف اشارہ ہے جو شریعت نے عورت کو دی ہیں۔

ہمارے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اندازِ بیان عورت کی تحقیر کے لیے نہیں ہے۔

اولاً، عورت کی دماغی اور جسمانی ساخت جیسی کچھ ہے اس کے خالق کی عطا کردہ ہے۔ اس میں عورت کو خود کوئی دخل نہیں کہ اُسے موردِ الزام ٹھہرایا جا سکے۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ کی زوجۂ محترمہ عین ایامِ حج میں حیض کی حالت میں آ گئیں تو وہ اس پر بہت آزردہ خاطر ہوئیں۔ نبیؐ نے دیکھا تو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ حالت تو بناتِ آدم کو ایک نَس کے جاری ہونے سے پیش آجاتی ہے۔ یہ عورت کے اپنے اختیار کی چیز نہیں کہ وہ اپنے کو قصور وار سمجھے، لہٰذا تم ایامِ حیض سے فارغ ہو کر عمرہ کر لینا۔ اس موقع

پر آنحضرتؐ نے اپنی زوجہ محترمہ سے حقارت کا کوئی سلوک نہیں کیا۔

ثانیاً، عورت کو جو ساخت عطا ہوئی ہے وہ اس کے فرائض اور ذمہ داریوں سے پوری پوری مطابقت رکھتی ہے اس لئے یہ اس کی کمزوری ہے بھی نہیں جس پر اسے مطعون کیا جا سکے۔ اولاد پیدا کرنا، اور اس کی پرورش اور تربیت کرنا عورت کے فرائض میں داخل ہے۔ اس کا جسم، طبیعت اور مزاج فاطر نے ان فرائض کے لیے موزوں بنایا ہے۔

اس ذمہ داری کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا دائرۂ عمل گھر تک محدود ہو اور بازار، تھانہ، کچہری وغیرہ کی ذمہ داری اصلاً اس کی نہ ہو۔ یہ مرد کا کام ہے کہ زندگی کی جدوجہد میں حصہ لے اپنے اور گھر والوں کے لئے روزی کمائے اور گھر سے باہر کے معاملات کو سنبھالے۔ مرد اور عورت میں فرائض کی یہ تقسیم اتنی فطری ہے کہ زمانۂ قدیم سے انسان نے اسے تسلیم کیا ہے اور عملاً آج بھی وہ اس پر قائم ہے انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں بھی عورت کی ہر کام میں کارکردگی کو تسلی بخش نہیں سمجھا جاتا اور اس کا مشاہرہ مردوں کی نسبت کم مقرر کیا جاتا ہے۔ خود اسلام نے فطرت کا لحاظ رکھا اور عورت کو گھر کا نگران قرار دیا ہے المرأۃ راعیۃ علی بیتِ زوجہا (عورت اپنے شوہر کے گھر کی ذمہ دار ہے) لہٰذا فرائض کی یہ تقسیم عورت کی تحقیر پر نہیں بلکہ فطرت پر مبنی ہے۔

ثالثاً، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ عورتیں اپنی نسوانی خصوصیات کی حفاظت کریں اور مرد ان سے معاملہ کرتے وقت ان خصوصیات کا لحاظ رکھیں تاکہ خواتین کی دل شکنی نہ ہو۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرت کو بگاڑنے والی ان عورتوں کو لعنت کا مستحق قرار دیا۔ جو اپنی خلقت کے برعکس مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں۔ اسی طرح آپؐ نے عورت کو پسلی سے تشبیہ دیتے ہوئے اس کی مزاجی خصوصیات پر روشنی ڈالی اور یہ تعلیم دی کہ اس کے ساتھ سازگاری پیدا کی جائے نہ کہ اس کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال المرأۃ کالضلع ان اقمتھا کسرتھا وان استمتعت بھا استمتعت بھا وفیھا عوج

(بخاری باب المداراۃ بالنساء)

ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورت ایک پسلی کی مانند ہے اگر تم اُسے سیدھا کرنے کے درپے ہو جاؤ تو اُسے توڑ دو گے اور اگر اس کے ٹیڑھے پن کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھاؤ گے تو فائدہ اٹھاتے رہو گے۔

پسلی کے ساتھ تشبیہ میں آنحضرتؐ نے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ جسم کے نظام میں ہر ساخت کی

ہڈی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض ہڈیاں سیدھی ہیں اور وہ اپنا کام اسی ساخت میں کر سکتی ہیں۔ پسلی کی ساخت میں گولائی ہے اور جسم کو صحیح شکل دینے اور نازک اعضا کی حفاظت کے لیے اسی ساخت کی ہڈی کی ضرورت تھی۔ اگر کوئی شخص پسلی کی گولائی کو اس کا عیب سمجھے اور اس کو سیدھا کرنے کے درپے ہو جائے تو وہ اُسے توڑ تو دے گا لیکن اُسے سیدھا کر کے کوئی مقصد حاصل نہ کر سکے گا۔ ٹھیک اسی طرح عورت کی اپنی مزاجی خصوصیات ہیں اور وہ ان کے ساتھ ہی اپنے فرائض سے عہدہ برا ہو سکتی ہے۔ کوئی مرد اگر اس میں ہر وقت میں میکھ نکالتا ہے اور عورت کو اپنی طبیعت کے بدلنے پر مجبور کرے تو اس کے نتائج خطرناک نکل سکتے ہیں۔

خلاصۂ بحث :

پس ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین میں زود رنجی اور لعن طعن کے شیوۂ احسان ناشناسی اور کفرانِ نعمت کی عادت اور مردوں کے لئے فتنہ سامانی کی اہلیت کو ان کے کردار کے خطرناک پہلوؤں کی حیثیت سے گنایا جو اس کی عاقبت کو خراب کر سکتے ہیں۔ آپ نے انہیں تعلیم دی کہ وہ ان پہلوؤں کو اپنے لئے مزلۂ قدم نہ بننے دیں بلکہ اپنی اصلاح کریں۔ جس کا ذریعہ آپؐ نے استغفار اور صدقہ تجویز فرمایا۔ اگر عورت اپنے کردار کے ان پہلوؤں پر قابو پا لے اور اپنی صلاحیتوں کو اچھے مصرف میں لائے تو وہ اپنا مقام ان نیک بیبیوں میں بنا سکتی ہے جو خداوند کے ہاں بلند درجات پانے والی ہیں۔

تزکیۂ نفس

امین احسن اصلاحی

تعلق باللہ اور اس کی اساسات

وفا

حیا کی طرح وفا بھی ایمان کے لازمی اور بنیادی تقاضوں میں سے ہے۔ وفا سے مراد یہ ہے کہ ہم نے اپنے رب سے جو عہد و میثاق کیے ہیں وہ پوری راست بازی کے ساتھ پورے کریں۔ یہ امر واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق دو مضبوط میثاقوں پر قائم ہے۔ ایک وہ میثاق ہے جو اس نے ہمارے پیدا کرنے سے پہلے ہماری ارواح سے لیا ہے اور جس کا ذکر سورۂ اعراف میں ہوا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ڔ شَهِدْنَا ڔ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ

(الاعراف۔ ۷: ۱۷۲)

اور یاد کرو، جب نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے — ان کی پیٹھوں سے — ان کی ذریت کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر، پوچھا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ بولے ہاں! تو ہمارا رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے۔

عہدِ فطرت:

یہی وہ عہد ہے جس کو قرآن نے عہدِ فطرت سے بھی تعبیر فرمایا ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (الروم۔ ۳۰: ۳۰)

اس دینِ فطرت کی پیروی کرو جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا۔

اس عہد میں جس طرح توحید کا اقرار شامل ہے اسی طرح تمام بنیادی نیکیوں کے نیکی اور تمام بڑی

برائیوں کے برائی ہونے کا شعور بھی شامل ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے خود انسان کے نفس کو اس کے اوپر ایک حجت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سورۂ شمس میں فرمایا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝

(الشمس۔ ۹۱: ۷-۱۰)

اور شاہد ہے نفس اور جیسا کچھ اس کو سنوارا۔ پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی کی۔ کامیاب ہوا جس نے اس کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا۔

اسی عہدِ فطرت کی بنا پر ہر سلیم الحواس انسان توحید اور بنیادی نیکیوں اور بدیوں سے متعلق قیامت کے دن مسئول ہوگا۔ خواہ اس کو کسی نبی کی دعوت پہنچی ہو یا نہ پہنچی ہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے ہر انسان پر حجت تمام کر دی ہے۔ جس کے بعد کوئی شخص، جیسا کہ سورۂ اعراف کی مذکورہ بالا آیت سے واضح ہے، یہ نہیں کہہ سکتا کہ "اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ" (الاعراف۔ ۷: ۱۷۲) (ہم تو ان باتوں سے بے خبر ہی رہے)۔

قرآن کے نزدیک اس عہدِ فطرت کا اذعان و یقین انسان کے اندر اتنا محکم ہے کہ کوئی شخص اپنے رب کی کوئی نافرمانی کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عین اس کے سامنے اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ چنانچہ سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے: "بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ" (القیٰمۃ۔ ۷۵: ۵) (بلکہ انسان چاہتا ہے کہ عین اپنے رب کے سامنے اس کی نافرمانی کرے)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان کا اپنا ضمیر خدائی کوتوال کی حیثیت سے اس کو عہدِ فطرت کی یاد دہانی کرتا رہتا ہے اور خود اپنے ضمیر کی یہ تنبیہ کوئی دوسرا سنتا ہو یا نہ سنتا ہو، لیکن آدمی خود اس کے سننے سے قاصر نہیں رہتا اگرچہ وہ کتنی ہی سخن سازیاں کرے: "بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰي نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ" (القیٰمۃ۔ ۷۵: ۱۴-۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر حجت ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذر تراشے)۔

اگرچہ ایک بہانہ باز یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کو نہ تو اس طرح کا کوئی عہد ہی یاد ہے اور نہ وہ اپنے اندر اس طرح کی کوئی خلش ہی محسوس کرتا جس کو ضمیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن آدمی سے اپنا باطن پوشیدہ نہیں ہوتا۔ اس کے اندر ایک نفسِ لوامہ چھپا ہوا ہے جو اس کو اس کی ہر خلافِ ضمیر حرکت پر اس وقت تک سرزنش کرتا رہتا ہے جب تک وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے اس کی زبان بالکل ہی بند

نہ کرے۔

باطن کی یہ آواز کسی خارجی دلیل و شہادت کی محتاج نہیں ہوتی ہے۔ اس کی دلیل و شہادت خود اس کے اندر ہی ہوتی ہے۔ خارج کی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی اس سے زیادہ واضح نہیں ہے کہ اس سے اس پر دلیل قائم کی جا سکے۔ اس کی دلیل بس یہ ہے کہ انسان اس کو اپنے اندر پا رہا ہے اور ایسے تواتر و تسلسل اور ایسی وضاحت و قطعیت کے ساتھ پا رہا ہے کہ اس کی کسی طرح بھی تکذیب نہیں کر سکتا الا آنکہ وہ ہٹ دھرمی سے کام لے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مشہور فلسفی کانٹ نے اس اندرونی آواز (inner voice) کو فلسفہ و منطق کے طریق احتجاج و استدلال کی گرفت سے بالکل بالاتر قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی یہ بات نہایت گہری حکمت پر مبنی ہے۔

یہ بات کہ انسان بدی کے بدی ہونے اور نیکی کے نیکی ہونے سے از روئے فطرت واقف ہے یوں بھی ثابت ہے کہ اگرچہ وہ خود دوسروں کے ساتھ بدی کرتا ہے، لیکن وہی بدی اگر دوسرا اس کے ساتھ کرے تو اس کو ظلم و ناانصافی ٹھہراتا اور اس کے خلاف احتجاج کرتا ہے یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ وہ نیکی اور بدی کے شعور سے عاری نہیں ہے، لیکن خود فریبی کے سبب سے اپنے لیے تو دوسروں سے وہ نیکی چاہتا ہے، لیکن دوسروں کے ساتھ بدی کی آزادی کا بھی خواہاں ہے۔ سورۂ مطففین میں قرآن نے اس کی اس کمزوری سے پردہ اٹھایا ہے:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا
عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝
وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَّزَنُوهُمْ
يُخْسِرُونَ ۝
(الْمُطَفِّفِين - ۸۳ : ۱-۳)

بُرا ہو، ناپ تول میں کمی کرنے والوں کا! جو دوسروں سے ناپوائیں تو پورا ناپوائیں اور جب ان کے لیے ناپیں یا تولیں تو اس میں کمی کریں۔

میثاق شریعت:

اگرچہ انسان پر حجت قائم کرنے اور اس کو مستوجب جزا و سزا قرار دینے کے لیے یہ عہدِ فطرت بھی کافی تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر مزید یہ فضل فرمایا کہ اپنے نبی اور رسول بھیج کر اور اپنی شریعت نازل کر کے اس عہدِ فطرت کو بالکل واضح اور مبرہن اور ہر پہلو سے جامع و مکمل بھی کر دیا کہ کسی گمراہی میں پڑنے کے لئے کوئی رخنہ باقی نہ رہے تاکہ جو ہلاک ہو وہ اتمام حجت کے بعد ہلاک ہو اور جو زندگی کی راہ اختیار

کرے وہ بھی دلیل کے ساتھ اختیار کرے:

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ
بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ
بَيِّنَةٍ (الانفال - ۸ : ۴۲)

تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے حجت دیکھ کر ہلاک ہو اور جسے زندگی حاصل کرنی ہے وہ حجت دیکھ کر زندگی حاصل کرے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ شریعت انسان کے لئے کوئی اوپری اور انوکھی چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ عہدِ فطرت کے اوپر ایک دوسرا میثاق ہے جس نے سابق میثاق کو مزید مؤکد و موثق کر دیا ہے، جس سے گمراہی کی ہر راہ مسدود ہو گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کو یوں کہیے کہ شریعت کی حیثیت انسان کے لیے تاریکی کے اوپر روشنی کی نہیں، بلکہ روشنی کے اوپر روشنی کی ہے۔ جیسا کہ سورہ نور میں ارشاد ہے نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ (النور - ۲۴ : ۳۵) (روشنی کے اوپر روشنی) جس سے انسان کا باطن اور ظاہر، دونوں جگمگا اٹھتے ہیں۔ اس تمثیل قرآن مجید میں یوں بیان ہوتی ہے:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ
مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۭ
فِيْ زُجَاجَةٍ ۭ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا
كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ
مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ
وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْۗءُ
وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۭ نُوْرٌ عَلٰي
نُوْرٍ ۭ (النور - ۲۴ : ۳۵)

اللہ ہی آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے۔ دل کے اندر اس کے نورِ ایمان کی تمثیل یوں ہے کہ ایک طاق ہو جس میں ایک چراغ ہو، چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو، شیشہ ایک چمکتے تارے کی مانند ہو۔ چراغ ایک ایسے شاداب درختِ زیتون کے روغن سے جلایا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی۔ اس کا روغن اتنا شفاف ہو کہ گویا آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑک اٹھے گا۔ روشنی کے اوپر روشنی!

شریعت کے عہد میثاق ہونے کا ذکر قرآن میں اتنی کثرت سے ہوا ہے کہ اس کے حوالے نقل کرنا تحصیل حاصل ہے۔ بعض عظیم سورتوں کا تو موضوع ہی اس میثاق کی عظمت و اہمیت اور اس کی ذمہ داریوں کی توضیح و تفصیل ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری وفاداری کے ساتھ اس میثاق کی پابندی ہی پر بندوں کی دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کا انحصار ہے۔ اس میثاق میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کے حقوق اور فرائض، دونوں تفصیل سے بیان کر دیے ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ بندے اپنے فرائض اگر وفاداری سے پورے کریں گے تو لازماً وہ اپنے حقوق اللہ تعالیٰ سے حاصل کریں گے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور اگر اس کی خلاف ورزی کریں گے تو اس بے وفائی کی سزا اس عالم

میں بھگتیں گے اور آخرت میں بھی۔

سورۂ مائدہ میں اس میثاق کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ (المائدة - ۵ : ۷)	اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جب کہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ سینوں کے بھیدوں سے بھی باخبر ہے۔

اس آیت میں 'نِعْمَةَ اللّٰهِ' سے مراد شریعتِ الٰہی ہے جو سب سے بڑے فضل کی حیثیت سے اس امت کو حاصل ہوئی اور 'میثاق' سے مراد وہ عہد و پیمان ہے جو اس شریعت پر پوری راست بازی اور کامل وفاداری سے عمل کرنے اور عمل کرانے کا لیا گیا اور پوری اُمّت نے 'سمعنا و اطعنا' کہہ کر اس عہد کی پابندی کا اقرار کیا۔ اگرچہ یہ اقرار اوّل اوّل امت کے ہراول دستہ یعنی حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین ہی نے کیا، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی مخاطب وہی تھے، لیکن ہم بھی اس عہد و اقرار میں برابر کے شریک ہیں اگر ہم ان مقدس اسلاف کے خلف ہونے کے مدعی ہیں اور اس شرف سے محروم ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

وفاداری بشرطِ استواری:

اس دوہرے میثاق کی ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا کوئی سہل بازی نہیں ہے۔ یہ بڑے جان جوکھم کا کام ہے۔ اس میں ہر قدم پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے امتحان ہیں جن سے صرف وہی عہدہ برآ ہوتے ہیں جن کو توفیقِ الٰہی کا بدرقہ حاصل ہو۔ اس میثاق کا صحیح صحیح حق ادا کرنے کے لیے اس حقیقت کو ہر وقت مستحضر رکھنا ضروری ہے کہ یہ حق صرف چند رسوم ادا کر دینے سے پورا نہیں ہوتا، بلکہ پوری صداقت اور پوری عزیمت کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے ہر حکم کی تعمیل اس کی شرطِ اوّل ہے اگرچہ اس راہ میں جان و مال اور کنبہ و خاندان، ہر چیز کو قربان کر دینا پڑے۔ ہم سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جن قوموں سے میثاق لیا جب انھوں نے محض شریعت کے چند رسوم ادا کر کے اس کے وفاداروں میں نام لکھوانے کی کوشش کی تو اس نے ان کو ٹھکرا دیا کہ اللہ تعالےٰ کو ایسے نام نہاد مدعیانِ وفاداری کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ، دونوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّاۗىِٕلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰھَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰىِٕكَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (البقرة - ۲ : ۱۷۷)	خدا کے ساتھ وفاداری محض یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف رُخ کر لو، بلکہ وفاداری ان کی وفاداری ہے جو اللہ پر، یومِ آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر صدقِ دل سے ایمان لائیں اور اپنے مال اس کی محبت کے باوجود قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور گردنیں چھڑانے پر خرچ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب معاہدہ کر بیٹھیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہوں۔ خاص کر وہ لوگ جو فقر و فاقہ، تکالیفِ جسمانی اور جنگ کے اوقات میں ثابت قدم رہنے والے ہوں، یہی لوگ ہیں جنہوں نے راست بازی دکھائی اور یہی لوگ ہیں جو سچے متقی ہیں۔

آیت کی تفسیر:

اس آیت نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچی وفاداری کے تمام تقاضے پوری وضاحت سے بیان کر دیے ہیں۔ اس وجہ سے ہم اس کے بعض اہم اجزاء کی شرح کر کے ان کا مفہوم اچھی طرح واضح کر دینا چاہتے ہیں تاکہ اوپر ہم نے جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں سے ہر بات 'قرآن کی روشنی میں' مبرہن ہو جائے۔

اس آیت میں لفظ 'بِرّ' جو آیا ہے اس کا ترجمہ عام طور پر ہمارے مترجم 'نیکی' کرتے ہیں۔ لیکن یہ اس لفظ کا ادھورا ترجمہ ہے جس سے اس کا پورا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ قرآن اور کلامِ عرب میں اس لفظ کے مواقعِ استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا صحیح مفہوم 'وفاداری' ہے۔ ہم نے اپنی تفسیر —— تدبرِ قرآن —— میں اس کی تحقیق بیان کی ہے۔ اس مادے سے لفظ 'بَرّ' بھی ہے جس کے معنی وفاشعار اور فرماں بردار کے ہیں، مثلاً 'بَرًّا بِوَالِدَيْهِ' اس بیٹے کو کہیں گے جو اپنے ماں باپ

کا نہایت وفادار اور ان کے حقوق ادا کرنے والا ہو۔ اسی طرح 'بَرٌّ' اللہ تعالےٰ کی صفت کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں سے جو عہد و پیمان اور جو وعدے کیے ہیں وہ سب ایک دن لازماً پورے کرنے والا ہے۔

اس روشنی میں 'لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ ...... الآیۃ' کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالےٰ کے ساتھ وفاداری کا حق صرف اتنے سے ادا نہیں ہو جاتا کہ رُخ مشرق کی طرف کر لیا۔ یہ تو محض دین کے ظواہر ہیں۔ اصل وفاداری اور دین داری تو ان لوگوں کی ہے جو اللہ پر، روزِ جزا و سزا پر، فرشتوں پر، کتابِ الٰہی پر سچا اور پکا ایمان لائیں اور ساتھ ہی قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور غلاموں کی آزادی کے لیے اپنے مال خرچ کریں۔

یہ بات جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، ان یہود و نصاریٰ کو مخاطب کرکے فرمائی گئی ہے جن کے ہاں ایک خاص دَور میں یہ بحث کہ قبلہ مشرق کی طرف ہے یا مغرب کی طرف اس زور شور سے چھڑی ہوئی تھی کہ گویا تمام دین کا انحصار بس اسی چیز پر ہے درآنحالیکہ دین کی بنیادی باتوں یعنی ایمان کے تقاضوں اور اس کے عملی مطالبات کا کسی کو بھی احساس نہیں تھا۔ ان کو مخاطب کرکے تنبیہ فرمائی گئی کہ نادانو، ان ظاہری رسم داریوں سے خدا کی وفاداری کا حق ادا نہیں ہوتا۔ خدا کا حق ادا کرنے والے وہ لوگ بنیں گے جو ایمان کے حقیقی عقائد کے اور عملی تقاضے پورے کرنے والے ثابت ہوں گے۔ یہ اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے یہود کو فرمائی کہ 'تم مچھر کو تو چھانتے ہو پر اونٹ کو نگل جاتے ہو' یا یہ کہ 'تم رکابی کو اوپر سے تو صاف کرتے ہو پر وہ اندر لوٹ کے مال سے بھری ہوتی ہے'۔

یہاں یہ بات نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ ایمان کے عملی تقاضوں میں سے سب سے پہلے انفاق کا ذکر آیا ہے حالانکہ قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ ایمان کے بعد وہ بالعموم نماز کا ذکر کرتا ہے، لیکن یہاں نماز کا ذکر مؤخر ہو گیا ہے۔ پھر مزید قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ 'ایتائے مال' کے ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا ذکر الگ ہوا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کے مال میں اللہ تعالےٰ کا حق صرف زکوٰۃ ہی نہیں، بلکہ اس کے علاوہ بھی ہے اور وفاداری کا مقام حاصل کرنے کے لیے اس کو ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

یہ پہلو خاصی اہمیت رکھنے والے ہیں اس وجہ سے ہم بالاختصار ان کی وضاحت کی کوشش کریں گے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہاں ایتائے مال کا ذکر اقامتِ صلوٰۃ پر مقدم ہے جو بظاہر قرآن کے معروف اسلوب کے خلاف ہے۔ لیکن اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ وہ یہ کہ یہاں بتانا

یہ مقصود ہے کہ مومن کو اللہ تعالےٰ کی کامل وفاداری کا مرتبہ و مقام کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ اس سوال کا واحد جواب، قرآن کی روشنی میں، یہی ہے کہ یہ مرتبہ اللہ تعالےٰ کی راہ میں محبوب مال کے انفاق سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام میں ارشاد ہے: 'لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ' ط (آل عمران - ۳ : ۹۲) (تم خدا کی وفاداری کا درجہ ہرگز نہیں حاصل کر سکتے جب تک ان چیزوں میں سے خرچ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو)۔ بالکل یہی بات یہاں 'وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ' کے الفاظ سے فرمائی ہے۔ یعنی وہ اپنے مال، ان کے محبوب ہونے کے باوجود، اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ مال کے محبوب ہونے کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مال بجائے خود اعلیٰ اور قیمتی ہو، دوسرا یہ کہ زمانہ ایسا ہو کہ اس میں وہ مال کمیاب ہو۔ مثلاً زمانہ قحط یا گرانی کا ہو۔ تیسرا یہ کہ آدمی کو خود اس مال کی احتیاج ہو، لیکن وہ اپنی ضرورت پر اللہ کے دوسرے بندوں کی ضرورت کو ترجیح دے: 'یُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ' قف (الحشر - ۵۹ : ۹) (وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انہیں خود احتیاج ہو)۔ یہاں 'عَلٰى حُبِّهٖ' کے الفاظ ان تمام پہلوؤں پر حاوی ہیں۔

رہا دوسرا سوال کہ کیا زکوٰۃ کے علاوہ مسلمان کے مال میں اللہ تعالےٰ کے کچھ اور حقوق بھی ہیں جن کا ادا کرنا مرتبۂ بِرّ و وفا حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ زکوٰۃ مسلمان کے مال میں سے کم سے کم مطالبہ ہے جس کا پورا کرنا اسلامی حکومت کی گرفت سے بچنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ مطالبہ پورا کر دینے کے بعد حکومت اس سے کوئی تعرض نہیں کرے گی لیکن اللہ تعالےٰ کا مطالبہ بندوں سے صرف زکوٰۃ کا نہیں ہے بلکہ انفاق کا ہے جو سِرّاً بھی ہو اور علانیۃً بھی۔ 'اِقراض' کا مطلب یہ ہے کہ اگر ملت کو کوئی ناگہانی ضرورت یا حالتِ جنگ یا قحط یا کوئی آفت کے باعث کوئی ناگزیر حاجت پیش آجائے تو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں دل کھول کر خرچ کریں۔ اللہ تعالےٰ اس کو اپنے ذمہ قرض کی حیثیت سے قبول فرمائے گا اور قیامت میں اس کو ایک عظیم خزانہ کی صورت میں واپس کرے گا بشرطیکہ یہ قرض، 'قرضِ حسن' ہو۔ اس انفاق کی آخری حد سے مقرر فرما دی ہے کہ اس طرح کے حالات میں آدمی اپنے اور اپنے بیوی بچوں کی ناگزیر ضروریات سے جو کچھ بچا سکے سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دے: 'قُلِ الْعَفْوَ' میں 'عفو' کی تفسیر ہمارے نزدیک یہی ہے۔ یہی انفاق ان لوگوں کے شایانِ شان ہے، جو اللہ کے وفادار اور کامل العیار بندے بننا چاہتے ہیں اور قرآن مجید کے تدبر سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ یہی انفاق ہے جس کے صلہ میں اللہ تعالےٰ انفاق کرنے والے کو حکمت کا خزانہ بخشتا ہے۔ جس کے بارے میں ارشاد ہے کہ 'وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا' ط (البقرۃ - ۲ : ۲۶۹) (اور جسے حکمت ملی اُسے خیر کثیر کا خزانہ ملا)۔

اس آیت میں 'وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا' کے الفاظ بھی خاص طور پر غور کرنے کے ہیں۔ اوپر کی باتیں تو فعل کے صیغوں میں بیان فرمائیں' لیکن ایفائے عہد کو صفت کے صیغہ سے بیان کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالٰے کے ساتھ وفاداری کا حق ٹھیک ٹھیک وہی لوگ ادا کر سکتے ہیں جن کے اندر ایفائے عہد کی خصلت صفۃً موجود ہو۔ وہ جب کبھی بھی کسی سے کوئی عہد کر بیٹھتے ہوں تو اس کے ایفاء کو اپنی فتوّت کا لازمی تقاضا اور اپنی حمیّت کا ایک واجبی مطالبہ سمجھتے ہوں۔ اس حقیقت کا اظہار 'اِذَا عٰهَدُوْا' کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ یعنی جب وہ کوئی عہد کر بیٹھتے ہیں تو قولِ مرداں جان دارد کے مصداق اس کے لیے جان لڑا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے عام وعدوں کے معاملہ میں جن کا کردار یہ ہوگا وہ اللہ تعالٰے سے کیے ہوئے عہد کے معاملہ میں کبھی کسی کمزوری کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے۔

'وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ' اس ٹکڑے کا عطف ہے تو 'وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ' ہی پر لیکن صفتِ صبر پر خاص طور پر زور دینے کے لیے اس کو حالتِ نصب میں کر دیا ہے۔ جس سے اس کے معنی میں یہ اضافہ ہو جائے گا کہ اللہ تعالٰے کی وفاداری کا حق ادا کرنے والے خاص طور پر وہ لوگ ہوں گے جو فقر و فاقہ، جسمانی تکلیف اور جنگ کے مصائب کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنے والے ہوں گے۔

یہی بات اس باب کی آخری بات ہے۔ ظاہر ہے کہ جب وفاداری بشرطِ استواری مطلوب ہے' جس کے بغیر ایمان، ایمان نہیں، بلکہ صریح نفاق ہے تو اس کے لیے سب سے بڑی شرط صبر یعنی عزیمت و استقامت ہی ٹھہرے گی۔ اللہ تعالٰے نے منافقین کو مخاطب کر کے سرزنش کی ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ تم ایمان کا دعویٰ کر کے اپنے کو اہلِ ایمان میں شمار کرا لوگے اور تمھارے جھوٹے اور سچے میں امتیاز کے لیے اللہ تعالٰے تمھیں کسی امتحان میں نہیں ڈالے گا؟ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالٰی کے ہاں ہر مدّعی کے لیے جگہ نہیں ہے۔ اس کے ہاں شرفِ باریابی صرف انھی کو حاصل ہو گا جو ہر قسم کے امتحانوں سے گزر کر یہ ثابت کر دیں گے کہ انھوں نے 'سمعنا واطعنا' کا جو عہد کیا ہے اس میں وہ بالکل سچے اور پکے ہیں۔ فرمایا کہ 'اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا' یہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے ہاں راست باز ٹھہریں گے اور 'وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ' اور یہی لوگ ہیں جو اس کی نگاہوں میں حقیقی متقی ہیں۔

امین احسن اصلاحی

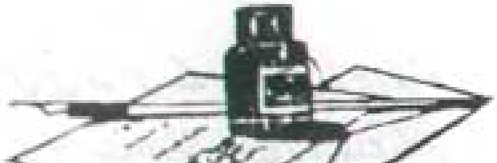

مراسلہ و مذاکرہ

سُودی قرضوں کے بَل پر ترقی

سوال: بین الاقوامی سطح پر قوموں کے درمیان سودی قرضوں کا لین دین قومی ترقی کے لیے کیا جائز اور باعثِ خیر ہو سکتا ہے؟ سودی قرضوں کے بغیر اجتماعی ترقی کیونکر ممکن ہے؟

جواب: اسلام میں سود کی ہر ممکنہ شکل کو حرام قرار دیا گیا ہے خواہ اس کی نوعیت کچھ ہی ہو۔ سود خواہ مہاجنی ہو یا تجارتی یا اس کا لین دین افراد کے درمیان ہو یا قوموں کے درمیان، وہ بڑے پیمانے پر ہو یا چھوٹے پیمانے پر، اس کو اسلام نے یک قلم ختم کر دیا ہے۔

جہاں تک بین الاقوامی سطح پر قوموں کے درمیان سودی لین دین کا تعلق ہے' خواہ وہ قومی ترقی جیسے اعلٰی مقصد ہی کے لیے ہو کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔ سود کی بے برکتی، تباہی اور ہلاکت ان قرضوں میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح افراد کے مابین مہاجنی اور تجارتی سودی معاملات میں ان دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

جو ملک یا قومیں سود کے جال میں پھنستی ہیں ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ملک کا ملک یا قوم کی قوم کسی سرمایہ دار ملک کی کنونڈی بن جاتی ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ اس کے لیے اپنے اقتدارِ اعلٰی کو بالفعل قائم رکھنا محال ہو جاتا ہے۔ ایسے ملک بظاہر تو آزاد اور خود مختار کہلاتے ہیں، لیکن اپنے نظام اور پالیسی کے اعتبار سے قوموں کی برادری میں غلام اور محکوم بن کر رہ جاتے ہیں۔ سودی قرضوں کے بوجھ تلے جب یہ پوری طرح دب جاتے ہیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس ملک کی سیاست، مذہب' داخلی و خارجی پالیسی دوسرے بالادست ملک کے محور پر گھومتی ہے۔ گویا اس کے پورے نظام پر محکومیت کا

رنگ غالب آجاتا ہے چنانچہ اگر آپ قومی سطح پر کسی سے سود پر قرض لیں اور اس کے سود کی جکڑ بند میں جکڑے ہوئے ہوں تو پھر آپ کے مستقبل، نظام، داخلی سیاست، خارجی سیاست اور تمام پالیسیوں پر لازماً اس کا اثر پڑتا ہے۔ ایک غریب آدمی اگر کسی متمول شخص سے سود پر قرض لیتا ہے تو زیادہ سے زیادہ اپنے ذاتی مفادات کی حد تک اس کا ممنون ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس کسی پورے کے پورے ملک یا پوری کی پوری قوم کا نظام یا پالیسیاں کسی دوسرے کی محکوم بن جائے تو یہ غلامی کی بدترین قسم اور نہایت بھیانک شکل ہے۔ جس کے شواہد ماضی کی تاریخ میں تو شاذ ملتے ہیں البتہ اس زمانے میں تیزی سے یہ وبا پھیل رہی ہے۔

یہ سودی قرض خواہ مستقبل کی کتنی حسین جنت کا نظارہ دیتا ہو مگر بالفعل نہایت تکلیف دہ اور کربناک دوزخ میں بالآخر دھکیل دیتا ہے۔ آپ یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ان قرضوں کی بدولت ملک ترقی کر رہا ہے، گوناگوں صنعتیں قائم ہو رہی ہیں، عمدہ قسم کی عمارتیں بن رہی ہیں، شاندار بند باندھے جا رہے ہیں، لیکن دوسری طرف ان زنجیروں کا پتہ نہیں چلتا جو زنجیریں قوم کے ہر فرد کے پاؤں میں پڑتی جا رہی ہیں جن کے نتیجہ میں قوم اجتماعی غلامی میں گرفتار ہوتی جا رہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قوموں کی اجتماعی ترقی کے لیے بھی صحیح طریقہ یہ ہوتا ہے کہ آپ قوم کے پاؤں کی تمام زنجیریں توڑ دیں۔ اس میں سلیقہ پیدا کریں، سنجیدگی کو پروان چڑھائیں۔ اس میں معاملات کے فہم کا اہتمام کریں، صرف اپنی آمدن پر اعتماد کریں اور اپنے ذرائع اس طرح استعمال کریں کہ وہ ثمر آور ہوں۔ اپنے لوگوں کی زندگیوں کو ایسے سانچے میں ڈھالیں کہ وہ اتنے ہی پاؤں پھیلائیں جتنی چادر ہے۔

اس مقصد کا حصول چنداں مشکل نہیں۔ اس کا بہت آسان طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ لیڈر جو کچھ قوم کو بنانا چاہتے ہیں وہ خود بن جائیں۔ قوم خود بخود اُن کے حسب منشا بن جائے گی۔ انسانی فطرت اور تاریخ دونوں اس کے شاہد ہیں کہ یہ طریقہ ہمیشہ کارگر ثابت ہوا ہے۔ یہ کام نہ تو اخبارات، رسائل، ریڈیو اور ٹیلی وژن کے بے روح اور لایعنی پراپیگنڈے کے ذریعے سے ہو سکتا ہے اور نہ کرائے کے ادیبوں، شاعروں اور مولویوں اور کاسہ لیسوں کے ذریعہ سے معاشرے کی کوئی اصلاح ہو سکتی ہے۔

صدرِ اوّل میں حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو کوئی زحمت نہیں پیش آئی تھی حالانکہ موجودہ دور کے معاشی پیمانوں سے ناپیے تو ان کے حصے میں ایسی قوم کی قیادت و رہنمائی آئی تھی جو نہایت مفلس اور قلاش کہی جا سکتی ہے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ وہ جو کچھ تھے عوام کو انھوں نے اس سے کچھ زیادہ ہی ڈھیل دے رکھی تھی، لیکن توازن بالکل قائم تھا۔ جس کو آگے چلنا ہوتا ہے اس کو آگے بڑھ کر کچھ اعلیٰ نمونہ بھی پیش کرنا پڑتا ہے۔ حضرت عمرؓ کو حضرت علیؓ نے کیا شاندار داد دی تھی کہ امیر المومنین آپ

باقی صفحہ پر

پروفیسر ارشاد الحسن

معاشرہ کا بگاڑ

ہمارا معاشرہ آج جس بگاڑ کا شکار ہے اس کا ظہور زندگی کے ہر دائرے میں کئی شکلوں میں ہو رہا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہم مسلمانوں میں بھی یہ تصور رائج ہو چکا ہے کہ مذہب کا تعلق پوری زندگی سے نہیں بلکہ رسومات کے ایک محدود دائرے سے ہے۔ چوبیس گھنٹے میں سے ایک دو گھنٹے نمازِ پنجگانہ کے لئے نکال لیجئے تو باقی وقت میں خدا کی یاد سے غافل ہونے کی گویا سند مل جاتی ہے اور من مانی کرنے کا پروانہ مل جاتا ہے۔ سال میں ایک مہینہ کے روزے رکھ لیجئے تو باقی گیارہ مہینے تزکیۂ نفس کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ مذہب کا یہ تصور مسیحیت کا طرۂ امتیاز ہے اور یہ اصل میں مادہ پرستوں کی ان کوششوں کا نتیجہ ہے جو انھوں نے مذہب کو زندگی سے بے دخل کرنے کے لئے کی ہیں۔

جب لوگوں کو دین کی تعلیمات کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے تو عجیب توجیہات پیش کی جاتی ہیں۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر مسلمان گھرانوں میں مستورات نہ صرف فلمی گیت گاتی ہیں بلکہ گانے کی لَے پر رقص بھی کرتی ہیں۔ ان حرکات کو یہ کہہ کر برداشت کر لیا جاتا ہے کہ صاحب، خوشی کا موقع ہے۔ یہ گیت اور رقص انبساطِ فطری کا ایک معصوم اظہار ہیں۔ اس وقت لوگ یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتے کہ اسلام شادی بیاہ یا کسی بھی تقریب کی آڑ میں خرافات کا مرتکب ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ ایک زبان زدِ عوام بات یہ کہی جاتی ہے کہ یہ دور آزادیٔ افکار کا ہے۔ حالانکہ آزادیٔ فکر کے مفہوم ہی سے ہمارے لوگ ناآشنا ہیں۔ آزادیٔ فکر کے لیے خیالات اور ذہن کی پختگی ضروری ہے۔ یہاں لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتی ہے جن میں حق و باطل کے خدوخال واضح نہیں ہوتے۔ اسلام سرے سے اس طرح کی آزادی کا مخالف ہے جو عقلِ سلیم کا منہ چڑاتی ہو، اخلاق کو پامال کرتی ہو اور صراطِ مستقیم سے ہٹا کر آدمی کو افراط و تفریط کا شکار کر دے۔ ایسی آزادی، آزادیٔ جہل کہلانے کی مستحق ہے۔

ہمارے معاشرے میں آج ہوسِ زر رائج الوقت سکہ ہے حالانکہ ہوسِ زر میں ملوث ہو کر رہ جانا

بہیمیت ہے ۔ یہ عہدِ حاضر کا ایک المیہ ہے کہ محض دولت کو وجۂ امتیاز اور باعث اعزاز و تکریم سمجھا جاتا ہے ۔ اسی لئے لوگ دولت کو اندھا دھند اکٹھا کرنے کے دَرپے ہیں ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ حرص و طمع کے جراثیم انسان کے دل سے جذبۂ رحم اور احساس مروّت و غمگساری کو ختم کر دیتے ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ سامنے آ رہا ہے کہ انسانؔ انسان سے بیگانہ اور تربیت و تزکیہ سے محروم ہو چکا ہے ۔

ہمارے معاشرہ کا بڑا طبقہ عہدِ حاضر کی بگڑی ہوئی اقدار کو اس لئے سینہ سے لگائے ہوئے ہے کہ وہ معاشرے کے ساتھ ہم آہنگی اور مطابقت کا دم بھرتے ہوئے مجبور ہے کہ مذہب کو ترک کرے ۔ اس کی حالت انگریزی ادبیات کے ایک کردار پروفراک کی سی ہے جو اس بات سے خائف رہتا تھا کہ اس کے ہاتھ سے conformity یعنی معاشرے کے ساتھ مطابقت کا دامن نہ چھوٹ جائے پروفراک کے کردار کے ذریعے ٹی ایس ایلیٹ یہ بتانا چاہتا ہے کہ جو لوگ معاشرے کے ساتھ مطابقت کے رسیا ہوتے ہیں ان کے اندر بھیڑ چال کے خلاف احتجاج کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا اور وہ ایک کھوکھلی زندگی بسر کرتے ہیں ۔

آج اس بات کی ضرورت ہے کہ عبادت کے محدود اور روایتی تصور کے بجائے اس کے وسیع تر تصور کو اپنایا جائے ۔ عبادت دل و دماغ کو خالقِ حقیقی کی طرف موڑ لینے کا نام ہے خدائے بزرگ و برتر کے قوانین ہمہ وقت جاری و ساری ہیں جن کی تعمیل ضروری ہے ۔ اسلام رسومات کا پلندہ نہیں بلکہ زندگی کے خدوخال کو سنوارنے والی ہدایتِ الٰہی پر مبنی دین ہے ۔ رضائے حق کے لئے مذہب کا محض دم بھرنا کافی نہیں بلکہ اس کے لئے ایمان و عرفان ، عمل صالح اور علمِ کامل کی ضرورت ہے ۔ اسلام کی روشنی رکھتے ہوئے ظلمات میں بھٹکنا ، سلامتی کی موجودگی میں فتنہ کو دعوت دینا ، صراطِ مستقیم کو جانتے ہوئے گم کردہ راہوں سے منزل کی نشان دہی کی توقع رکھنا ، ویرانوں سے سرچشمے کی امید باندھنا ، سفینہ کے ہوتے ہوتے تنکوں کا سہارا لینا اور روحانی اقدار کو تج کر مادیت میں فلاح و کامرانی کی راہ تلاش کرنا عقلمندی نہیں بلکہ سراسر جہالت ہے ۔ خوب سے خوب تر کی تلاش تقاضائے فطرت اور ارتقائے انسانی ہے ۔ یہی تلاش ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں لے آتی ہے کیونکہ آپ ہی کا وہ ابرِ گوہر بار تھا جس نے دکھی دنیا کے سنگلاخ میں راحت و طمانیت کے پھول کھلائے اور عرب و عجم کو سیراب کیا ۔ خدا کرے کہ ہمارے معاشرے میں بھی یہ احساس جاگزیں ہو کہ اطمینانِ قلب اسلام سے آزاد ہونے میں نہیں بلکہ اس کا طوق گلے میں ڈالنے میں ہے ۔